رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاھور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل ومسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۲)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ - مطابق فروری ۱۹۵۳ء	جلد ۳۹

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ماہ جنوری میں پاکستان کے ۳۳ سربرآوردہ علماء نے تازہ دستوری سفارشات پر غور و خوض کرکے جو اصلاحات اور جوابی تجاویز مرتب کی ہیں ان میں سے ایک اہم تجویز یہ بھی ہے کہ اُن تمام لوگوں کو جو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں، ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے اور ان کے لیے پنجاب اسمبلی میں ایک نشست مخصوص کر دی جائے۔ جہاں تک علماء کی دوسری تجاویز کا تعلق ہے، ان کی معقولیت اتنی واضح ہے کہ علماء کے مخالفین کو بھی ان پر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی اور اگر انہوں نے کچھ کہا بھی تو وہ جگر سوختہ کے دھوئیں سے زیادہ نہ تھا جس کا ملک کے پڑھے لکھے اور ذی فہم لوگوں کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں ہو سکتا لیکن اس خاص تجویز کے بارے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ قادیانی مسئلے کا بہترین حل ہونے کے باوجود تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد ابھی تک اس کی صحت و معقولیت کی قائل نہیں ہو سکی ہے، اور پنجاب و بہاولپور کے ماسوا دوسرے علاقوں میں، خصوصاً بنگال میں، ابھی عوام الناس بھی پوری طرح اس کا وزن محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اِن صفحات میں پوری وضاحت کے ساتھ وہ دلائل بیان کر دیں جن کی بنا پر علماء نے بالاتفاق یہ تجویز پیش کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں کا مسلمانوں سے الگ ایک اُمت ہونا اُس پوزیشن کا ایک لازمی منطقی نتیجہ ہے جو انہوں نے خود اختیار کی ہے۔ وہ اسباب ان کے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں جو انہیں مسلمانوں سے کاٹ کر ایک جداگانہ ملت بنا دیتے ہیں۔

پہلی چیز جو انہیں مسلمانوں سے جدا کرتی ہے وہ ختم نبوت کی نئی تفسیر ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی متفق علیہ تفسیر سے ہٹ کر اختیار کی۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے تمام مسلمان بالاتفاق یہ مانتے رہے ہیں اور آج بھی

یہی مانتے ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی نبی مبعوث ہونے والا نہیں ہے۔ ختم نبوت کے متعلق قرآن مجید کی تصریح کا یہی مطلب صحابہ کرام نے سمجھا تھا۔ اور اسی لیے انہوں نے ہر اس شخص کے خلاف جنگ کی جس نے حضورؐ کے بعد دعوائے نبوت کیا۔ پھر یہی مطلب بعد کے ہر دور میں تمام مسلمان سمجھتے رہے جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے درمیان کبھی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کیا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو۔ لیکن قادیانی حضرات نے تاریخ میں پہلی مرتبہ "خاتم النبیین" کی یہ نرالی تفسیر کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "نبیوں کی مُہر" ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ حضورؐ کے بعد اب جو بھی نبی آئے گا اس کی نبوت آپ کی مہرِ تصدیق لگ کر مصدقہ ہو گی۔

اس کے ثبوت میں قادیانی لٹریچر کی بکثرت عبارتوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، مگر ہم صرف تین حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں:-

خاتم النبیین کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مُہر کے بغیر کسی کی نبوت تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب مُہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت کی مُہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔" (ملفوظات احمدیہ مرتبہ محمد منظور الٰہی صاحب قادیانی، حصہ پنجم ص ۲۹۰)

"ہمیں اس سے انکار نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں مگر ختم کے معنی وہ نہیں جو "احسان" کا سوادِ اعظم سمجھتا ہے اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اعلیٰ وارفع کے سراسر خلاف ہے کہ آپ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے اپنی امت کو محروم کر دیا۔ بلکہ یہ ہیں کہ آپ نبیوں کی مُہر ہیں۔ اب وہی نبی ہوگا جس کی آپ تصدیق کریں گے ...... انہی معنوں میں ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں"۔ (الفضل، قادیان، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

"خاتم مُہر کو کہتے ہیں۔ جب نبی کریم مُہر ہوئے، اگر ان کی امت میں کسی قسم کا نبی نہیں ہوگا تو وہ مُہر کس طرح ہوئے یا مُہر کس پر لگے گی؟" (الفضل قادیان، مورخہ ۲۲ مئی سنہ ۱۹۲۲ء)

تفسیر کا یہ اختلاف صرف ایک نقطہ کی تاویل و تفسیر تک ہی محدود نہ رہا بلکہ قادیانیوں نے آگے بڑھ کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نہیں، ہزاروں نبی آسکتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے اپنے بیانات سے ثابت ہے جن میں سے صرف چند کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"یہ بات بالکل روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے۔" (حقیقۃ النبوت مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان، ص ۲۲۸)

"انہوں نے (یعنی مسلمانوں نے) یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے۔۔۔۔ ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدر کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے، ورنہ ایک نبی کیا میں تو کہتا ہوں ہزاروں نبی ہونگے۔" (انوارِ خلافت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب۔ ص ۶۲)

"اگر میری گردن کے دونوں طرف تلوار بھی رکھ دی جائے اور مجھے کہا جائے کہ تم یہ کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو میں اسے ضرور کہونگا کہ تو جھوٹا ہے، کذاب ہے، آپ کے بعد نبی آسکتے ہیں اور ضرور آسکتے ہیں۔" (انوارِ خلافت ص ۶۵)

اس طرح نبوت کا دروازہ کھول کر مرزا غلام احمد صاحب نے خود اپنی نبوت کا دعویٰ کیا اور قادیانی گروہ نے اُن کو حقیقی معنوں میں نبی تسلیم کیا۔ اس کے ثبوت میں قادیانی حضرات کی بے شمار مستند تحریرات میں سے چند یہ ہیں:۔

"اور مسیح موعود (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) نے بھی اپنی کتابوں میں اپنے دعویٰ رسالت و نبوت کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے جیسا کہ آپ لکھتے ہیں کہ "ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول اور نبی ہیں۔" (دیکھو بدر، ۵ مارچ ۱۹۰۸ء) یا جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ "میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں۔ اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا۔ اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیونکر اس سے انکار کر سکتا ہوں۔ میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک جو اس دنیا سے گزر جاؤں" (دیکھو خط حضرت مسیح موعود بہ طرف ایڈیٹر اخبار عام لاہور) یہ خط حضرت مسیح موعود

نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۲۳ مئی ۱۹۰۸ء کو لکھا اور آپ کے یوم وصال ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو اخبار عام میں شائع ہوا۔" (کلمۃ الفصل مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب قادیانی۔ مندرجہ ریویو آف ریلیجنز نمبر ۳، جلد ۱۴، ص ۱۱۰)

"پس شریعت اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت صاحب (یعنی مرزا غلام احمد صاحب) ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔" (حقیقۃ النبوۃ، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان ص ۱۷۴)

نبوت کے دعوے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اُس نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر قرار دیا جائے۔ چنانچہ قادیانیوں نے یہی کیا۔ وہ اُن تمام مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر میں علانیہ کافر قرار دیتے ہیں جو مرزا غلام احمد صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ اس کے ثبوت میں اُن کی چند صریح عبارتیں یہ ہیں:۔

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" (آئینہ صداقت مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان ص ۳۵)

"ہر ایک ایسا شخص جو موسیٰ کو مانتا ہے مگر عیسیٰ کو نہیں مانتا، یا عیسیٰ کو مانتا ہے مگر محمد کو نہیں مانتا، یا محمد کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" (کلمۃ الفصل، مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد صاحب قادیانی، مندرجہ ریویو آف ریلیجنز ص ۱۱۰)

"ہم چونکہ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور غیر احمدی آپ کو نبی نہیں مانتے اس لیے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کہ کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے غیر احمدی کافر ہیں۔" (بیان مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب باجلاس سب جج عدالت گورداسپور، مندرجہ اخبار الفضل مورخہ ۲۶/۲۹ جون ۱۹۲۲ء)

وہ صرف یہی نہیں کہتے کہ مسلمانوں سے ان کا اختلاف محض مرزا صاحب کی نبوت کے معاملے میں ہے، بلکہ وہ

کہتے ہیں کہ ہمارا خدا، ہمارا اسلام، ہمارا قرآن، ہماری نماز، ہمارا روزہ، غرض ہماری ہر چیز مسلمانوں سے الگ ہے۔
۲۱ر اگست ۱۹۱۷ء کے الفضل میں خلیفہ صاحب کی ایک تقریر "طلبا کو نصائح" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے اپنی جماعت کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان کیا اختلاف ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں :۔

"ورنہ حضرت مسیح موعود نے تو فرمایا ہے کہ اُن کا (یعنی مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور، اُن کا خدا اور ہے اور ہمارا اور، ہمارا حج اور ہے اُن کا حج اور، اسی طرح اُن سے ہر بات میں اختلاف ہے"

۳۰ر جولائی ۱۹۳۱ء کے الفضل میں خلیفہ صاحب کی ایک اور تقریر شائع ہوئی ہے جس میں وہ اس بحث کا ذکر کرتے ہیں جو مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی میں اس مسئلے پر چھڑ گئی تھی کہ احمدیوں کو اپنا ایک مستقل مدرسہ دینیات قائم کرنا چاہیے یا نہیں۔ اُس وقت ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ نہیں کرنا چاہیے، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ "ہم میں اور دوسرے مسلمانوں میں چند مسائل کا اختلاف ہے، ان مسائل کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حل کر دیا ہے اور ان کے دلائل بتا دیے ہیں، باقی باتیں دوسرے مدرسوں سے سیکھی جا سکتی ہیں" دوسرا گروہ اس کے برعکس رائے رکھتا تھا۔ اس دوران میں مرزا غلام احمد صاحب آ گئے اور انہوں نے یہ ماجرا سن کر اپنا فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کو خلیفہ صاحب ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں :۔

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرض آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں اُن سے ہمیں اختلاف ہے"

اس ہمہ گیر اختلاف کو اس کے آخری منطقی نتائج تک بھی قادیانیوں نے خود ہی پہنچا دیا اور مسلمانوں سے تمام تعلقات منقطع کر کے ایک الگ امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی تنظیم کر لی۔ اس کی شہادت قادیانیوں کی اپنی تحریرات سے ہمیں یہ ملتی ہے :۔

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سختی سے تاکید فرمائی ہے کہ کسی احمدی کو غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ باہر سے لوگ اس کے متعلق بار بار پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں تم جتنی دفعہ بھی پوچھو گے اتنی دفعہ ہی میں یہی جواب دوں گا کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز نہیں جائز نہیں، جائز نہیں" (انوار خلافت، مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۂ قادیان ص ۸۹)

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں" (انوار خلافت ص ۹۰)

"اگر کسی غیر احمدی کا چھوٹا بچہ مر جائے تو اس کا جنازہ کیوں نہ پڑھا جائے، وہ تو مسیح موعود کا منکر نہیں؟ میں یہ سوال کرنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا جاتا؟ . . . غیر احمدی کا بچہ بھی غیر احمدی ہی ہوا، اس لیے اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھنا چاہیے" (انوار خلافت ص ۹۳)

"حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفۂ اول نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا" (انوار خلافت، ص ۹۳-۹۴)

حضرت مسیح موعود نے غیر احمدیوں کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریم نے عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں، ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا، ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں؟ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی، دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے۔ اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لیے حرام قرار

دیے گئے۔ اگر کہو کہ ہم کو اُن کی لڑکیاں لینے کی اجازت ہے، تو میں کہتا ہوں نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں کو سلام کیوں کیا جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض اوقات نبی کریم نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔"

(کلمۃ الفصل۔ مندرجہ ریویو آف ریلیجنز۔ ص ۱۶۹)

یہ قطع تعلق صرف تحریر و تقریر ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ پاکستان کے لاکھوں آدمی اس بات کے شاہد ہیں کہ قادیانی عملاً بھی مسلمانوں سے کٹ کر ایک الگ امت بن چکے ہیں۔ نہ وہ ان کے ساتھ نماز کے شریک، نہ جنازے کے، نہ شادی بیاہ کے۔ اب اس کے بعد آخر کونسی معقول وجہ رہ جاتی ہے کہ ان کو اور مسلمانوں کو زبردستی ایک امت میں باندھ رکھا جائے؟ جو علیحدگی نظریے اور عمل میں فی الواقع رونما ہو چکی ہے اور پچاس برس سے قائم ہے، آخر اب اسے آئینی طور پر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی تحریک نے ختم نبوت کی اُن حکمتوں اور مصلحتوں کو اب تجربے سے ثابت کر دیا ہے جنہیں پہلے محض نظری حیثیت سے سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل تھا۔ پہلے ایک شخص یہ سوال کر سکتا تھا کہ آخر کیوں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد دنیا سے ہمیشہ کے لیے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا؟ لیکن اب اس قادیانی تجربے نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ امتِ مسلمہ کی وحدت اور استحکام کے لیے ایک نبی کی متابعت پر تمام کلمہ گویانِ توحید کو مجتمع کر دینا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے اور نئی نئی نبوتوں کے دعوے کس طرح ایک امت کو پھاڑ کر اس کے اندر مزید امتیں بنانے اور اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر دینے کے موجب ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ تجربہ ہماری آنکھیں کھول دے اور ہم اس نئی امت کو مسلمانوں سے کاٹ کر الگ کر دیں تو پھر کسی کو نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے اور امتِ مسلمہ کے اندر پھر سے قطع و برید کا سلسلہ شروع کرنے کی ہمت نہ ہو گی۔ ورنہ ہمارے اس ایک قطع و برید کو برداشت کر لینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ایسے ہی دوسرے بہت سے حوصلہ مندوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ ہمارا آج کا تحمل کل دوسروں کے لیے نظیر بن جائے گا اور معاملہ ایک قطع و برید پر ختم نہ ہو گا بلکہ آئے دن ہمارے معاشرے کو نئی نئی

پراگندگیوں کے خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ ہے وہ اصل دلیل جس کی بنا پر ہم قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس دلیل کا کوئی معقول جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ مگر سامنے سے اِس کا مقابلہ کرنے کے بجائے چند دوسرے سوالات چھیڑے جاتے ہیں جو براہِ راست نفسِ معاملہ سے متعلق نہیں ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ

مسلمانوں میں اس سے پہلے بھی مختلف گروہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، اگر اسی طرح ایک ایک کی تکفیر پر دوسرے کو امت سے کاٹ دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو سرے سے کوئی امتِ مسلمہ باقی ہی نہ رہے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں قادیانیوں کے علاوہ چند اور گروہ بھی ایسے موجود ہیں جو نہ صرف بنیادی عقائد میں سوادِ اعظم سے گہرا اختلاف رکھتے ہیں بلکہ عملاً انہوں نے اپنی اجتماعی شیرازہ بندی بھی مسلمانوں سے الگ کر رکھی ہے اور قادیانیوں کی طرح وہ بھی سارے مذہبی و معاشرتی تعلقات مسلمانوں سے منقطع کیے ہوئے ہیں۔ پھر کیا اُن سب کو بھی امت سے کاٹ پھینکا جائے گا؟ یا یہ معاملہ کسی خاص ضد کی وجہ سے صرف قادیانیوں ہی کے ساتھ کیا جا رہا ہے؟ آخر قادیانیوں کا وہ خاص قصور کیا ہے جس کی بنا پر اس طرح کے دوسرے گروہوں کو چھوڑ کر خصوصیت کے ساتھ انہی کو الگ کرنے کے لیے اتنا اصرار کیا جاتا ہے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علٰحدگی کا مطالبہ تو اقلیت کیا کرتی ہے، مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ آج اکثریت کی طرف سے اقلیت کو الگ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے حالانکہ اقلیت اس کے ساتھ رہنے پر مُصر ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن پر یہ خیال بھی مسلط ہے کہ قادیانی حضرات ابتدا سے عیسائیوں، آریہ سماجیوں اور دوسرے حملہ آوروں کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت کرتے رہے ہیں اور دنیا بھر میں وہ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ سلوک زیبا نہیں ہے۔

اور آخر میں اب یہ بات بھی بڑے معتبر ذرائع سے سننے میں آئی ہے کہ قادیانیوں کے خلاف یہ قدم اٹھانا ہمارے ذمہ دارانِ حکومت کے نزدیک پاکستان کے لیے سیاسی حیثیت سے بہت نقصان دہ ہے، کیونکہ ان کی رائے میں قادیانی وزیرِ خارجیہ کا ذاتی اثر انگلستان اور امریکہ میں بہت زیادہ ہے اور ہم کو ان ملکوں سے جو کچھ بھی مل سکتا ہے انہی کے توسط سے مل سکتا ہے۔

آخری بات چونکہ ذرا مختصر ہے اس لیے پہلے ہم اسی کا جواب دیں گے، پھر دوسرے سوالات پر بحث کریں گے اگر یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ذمہ دارانِ حکومت یہی خیال رکھتے ہیں تو ہمارے نزدیک ایسے کوڑ مغز اور کند ذہن لوگوں کی قیادت سے یہ ملک جتنی جلدی نجات پا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ جو لوگ ایک ملک کی قسمت کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص پر منحصر سمجھتے ہیں وہ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی پاکستان کی زمام کار ان کے ہاتھ میں رہنے دی جائے۔ انگلستان اور امریکہ میں کوئی سیاسی مدبر اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ آٹھ کروڑ کی آبادی رکھنے والے ایک عظیم الشان ملک اور اس کے ذرائع و وسائل اور اس کے جغرافی محل وقوع کا وزن محسوس کرنے کے بجائے صرف ایک شخص کا وزن محسوس کرے، اور اس ملک کے ساتھ جو کچھ بھی معاملہ کرے اُس شخص کی خاطر کرے اور اُس شخص کے ہٹتے ہی پورے ملک سے اس لیے روٹھ جائے کہ تم نے اُسی ایک آدمی کو ہٹا دیا جس کے پاسِ خاطر سے ہم تمہیں "روٹی کپڑا" دے رہے تھے! یہ احمقانہ بات اگر انگلستان اور امریکہ کے لوگ سن پائیں تو وہ ہمارے "مدبرینِ عظام" کی عقل پر بے اختیار ہنس پڑیں گے اور انہیں سخت حیرت ہوگی کہ ایسے ایسے طفلِ مکتب اس ملک کے سربراہ کار بنے ہوئے ہیں جنہیں اتنی موٹی سی بات بھی معلوم نہیں ہے کہ باہر کی دنیا میں قادیانی وزیر خارجیہ کو جو کچھ بھی اہمیت حاصل ہے پاکستان کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ پاکستان کی اہمیت اس خاص وزیرِ خارجیہ کے طفیل۔

اب ہم اوپر کے سوالات میں سے ایک ایک کو لے کر سلسلہ وار ان کا جواب دیتے ہیں۔

بلاشبہ مسلمانوں میں یہ ایک بیماری پائی جاتی ہے کہ ان کے مختلف گروہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے

رہے ہیں اور اب بھی بعض گروہوں کا یہ شغل نامبارک جاری ہے۔ لیکن اس کو حجت بنا کر قادیانی گروہ کو امتِ مسلمہ میں شامل رکھنا کئی وجوہ سے غلط ہے۔

اوّلاً، اس شغلِ تکفیر کی بعض غلط اور بُری مثالوں کو پیش کرکے یہ کلی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ تکفیر ہمیشہ غلط ہی ہوتی ہے اور سرے سے کسی بات پر کسی کی تکفیر ہونی ہی نہ چاہیے۔ فروعات کے ذرا ذرا سے اختلافات پر تکفیر کر دینا اگر ایک غلط حرکت ہے تو اسی طرح دین کی بنیادی حقیقتوں سے کھلے کھلے انحراف پر تکفیر نہ کرنا بھی سخت غلط ہے۔ جو لوگ بعض علماء کی بے جا تکفیر بازی سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ ہر قسم کی تکفیر سرے سے ہی بے جا ہے۔ اُن سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہر شخص ہر حال میں مسلمان ہی رہتا ہے خواہ وہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے یا نبوت کا مدعی ہو یا اسلام کے بنیادی عقائد سے صریحاً منحرف ہو جائے؟

ثانیاً، مسلمانوں کے جن گروہوں کی باہمی تکفیر بازی کو آج حجت بنایا جا رہا ہے ان کے سربرآوردہ علماء ابھی ابھی کراچی میں سب کے سامنے جمع ہوئے تھے اور انہوں نے بالاتفاق اسلامی حکومت کے اصول مرتب کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہوئے ہی یہ کام کیا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے بعض عقائد کو کافرانہ عقائد کہنے اور سمجھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کو خارج از دائرۂ اسلام نہ کہتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں؛ لہٰذا یہ اندیشہ بالکل فرضی ہے کہ قادیانیوں کو الگ کرنے کے بعد مختلف گروہوں کو امت سے کاٹ پھینکنے کا ایک سلسلہ چل پڑے گا۔

ثالثاً، قادیانیوں کی تکفیر کا معاملہ دوسرے گروہوں کی باہمی تکفیر بازی سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ قادیانی ایک نئی نبوت سے کر اٹھے ہیں جو لازماً اُن تمام لوگوں کو ایک امت بناتی ہے جو اس نبوت پر ایمان لے آئیں اور اُن تمام لوگوں کو کافر بنا دیتی ہے جو اس پر ایمان نہ لائیں۔ اسی بنا پر قادیانی تمام مسلمانوں کی تکفیر پر متفق ہیں اور تمام مسلمان ان کی تکفیر پر متفق۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا بنیادی اختلاف ہے جس کو مسلمانوں کے باہمی فروعی اختلافات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

بلاشبہ مسلمانوں میں قادیانیوں کے علاوہ بعض اور گروہ بھی ایسے موجود ہیں جو اسلام کی بنیادی حقیقتوں

میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور مذہبی و معاشرتی تعلقات منقطع کر کے اپنی جداگانہ تنظیم کر چکے ہیں۔ لیکن چند وجوہ ایسے ہیں جن کی بنا پر ان کا معاملہ قادیانیوں سے بالکل مختلف ہے۔

وہ مسلمانوں سے کٹ کر بس الگ تھلگ ہو بیٹھے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے چند چھوٹی چھوٹی ٹپانیں ہوں جو سرحد پر پڑی ہوئی ہوں۔ اس لیے اُن کے وجود پر صبر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قادیانی مسلمانوں کے اندر مسلمان بن کر گھستے ہیں، اسلام کے نام سے اپنے مسلک کی اشاعت کرتے ہیں، مناظرہ بازی اور جارحانہ تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اور مسلم معاشرے کے اجزاء کو توڑ توڑ کر اپنے جداگانہ معاشرے میں شامل کرتے جا رہے ہیں۔ اُن کی ان کوششوں سے مسلم معاشرے میں اختلال و انتشار کا ایک مستقل فتنہ برپا ہے جس کی وجہ سے ان کے معاملے میں ہمارے لیے وہ صبر ممکن نہیں ہے جو دوسرے گروہوں کے معاملے میں کیا جا سکتا ہے۔

اُن گروہوں کا مسئلہ ہمارے لیے صرف ایک دینیاتی مسئلہ ہے کہ آیا اپنے مخصوص عقائد کی بنا پر وہ اسلام کے پیرو سمجھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر بالفرض وہ اسلام کے پیرو نہ بھی مانے جائیں تو جس جمود کی حالت میں وہ ہیں اُس کی وجہ سے اُن کا مسلمانوں میں شامل رہنا ہمارے لیے نہ خطرۂ ایمان ہے اور نہ کوئی معاشرتی، معاشی یا سیاسی مسئلہ ہی پیدا کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں قادیانی مسلک کی مسلسل تبلیغ ایک طرف لاکھوں ناواقف دین مسلمانوں کے لیے ایمان کا خطرہ بنی ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف جس خاندان میں بھی ان کی یہ تبلیغ کارگر ہو جاتی ہے وہاں فوراً ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں شوہر اور بیوی میں جدائی پڑ رہی ہے، کہیں باپ اور بیٹے ایک دوسرے سے کٹ رہے ہیں، اور کہیں بھائی اور بھائی کے درمیان شادی و غم کی شرکت تک کے تعلقات منقطع ہو رہے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ قادیانیوں کی جتھہ بندی سرکاری دفتروں میں، تجارت میں، صنعت میں، زراعت میں، غرض زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہے جس سے معاشرتی مسئلے کے علاوہ اور دوسرے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

پھر دوسرے گروہوں کے کوئی ایسے سیاسی رجحانات نہیں ہیں جو ہمارے لیے کسی حیثیت سے خطرناک ہوں اور ہمیں مجبور کرتے ہوں کہ ہم فوراً ان کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر کریں۔ لیکن قادیانیوں کے اندر

بعض ایسے خطرناک سیاسی رجحانات پائے جاتے ہیں جن سے کسی طرح آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔

ان کو ابتدا سے یہ احساس رہا ہے کہ ایک نئی نبوت کا دعویٰ لے کر جو شخص یا گروہ اٹھے اس کا کسی آزاد و با اختیار مسلم سوسائٹی کے اندر پنپنا مشکل ہے۔ وہ مسلم قوم کے مزاج سے واقف ہیں کہ وہ طبعاً ایسے دعووں سے متنفر ہے جو ماننے اور نہ ماننے والوں کے درمیان کفر و اسلام کی تفریق کرکے نظام دین کو اور اسلامی معاشرے کے نظام کو درہم برہم کرتے ہوں۔ وہ مسلمانوں کی تاریخ سے واقف ہیں کہ صحابۂ کرام کے دور سے لے کر آج تک اس طرح کے مدعیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ جہاں حکومت مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہو وہاں نئی نئی نبوتوں کے چراغ نہ کبھی جلنے دیے گئے ہیں اور نہ آئندہ کبھی امید کی جاسکتی ہے کہ جلنے دیے جائیں گے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف ایک غیر مسلم حکومت ہی میں آدمی کو یہ آزادی مل سکتی ہے کہ حکومت کو اپنی وفاداری و خدمت گزاری کا پورا اطمینان دلانے کے بعد مذہب کے دائرے میں جو دعویٰ چاہے کرے اور مسلمانوں کے دین، ایمان اور معاشرے میں جیسے فتنے چاہے اٹھاتا رہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ اسلام کی حکومت پر کفر کی حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شکارگاہ مسلمان قوم ہی ہے، کیونکہ وہ اسلام کے نام پر اپیل کرتے ہیں اور قرآن و حدیث کے اسلحہ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کا مفاد یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمان قوم ایک کافر اقتدار کے پنجے میں بے بس ہو کر ان کی شکارگاہ بنی رہے اور یہ اس کافر اقتدار کے پکے وفادار بن کر اس کا شکار کرتے رہیں۔ ایک آزاد و خود مختار مسلمان قوم ان کے لیے بڑی سنگلاخ زمین ہے جسے وہ دل سے پسند نہیں کرتے اور نہیں کرسکتے۔

اس کے ثبوت میں مرزا غلام احمد صاحب اور ان کی جماعت کے بکثرت بیانات میں سے صرف چند کا نقل کر دینا کافی ہے:۔

"بلکہ اس گورنمنٹ کے ہم پر اس قدر احسان ہیں کہ اگر ہم یہاں سے نکل جائیں تو نہ ہمارا مکہ میں گزارا ہو سکتا ہے اور نہ قسطنطنیہ میں۔ تو پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے برخلاف کوئی خیال اپنے دل میں رکھیں۔" (ملفوظاتِ احمدیہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۴۶)

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں نہ روم میں نہ شام میں نہ ایران میں نہ کابل میں مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لیے دعا کرتا ہوں"

(تبلیغ رسالت، مرزا غلام احمد صاحب، جلد ششم ص ۶۹)

"یہ تو سوچو کہ اگر تم اس گورنمنٹ کے سائے سے باہر نکل جاؤ تو پھر تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ ایسی سلطنت کا بھلا نام تو لو جو تمہیں اپنی پناہ میں لے لے گی۔ ہر ایک اسلامی سلطنت تمہارے قتل کرنے کے لیے دانت پیس رہی ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں تم کافر اور مرتد ٹھہر چکے ہو۔ سو تم اس خداداد نعمت کی قدر کرو اور تم یقیناً سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ نے سلطنت انگریزی تمہاری بھلائی کے لیے ہی اس ملک میں قائم کی ہے اور اگر اس سلطنت پر کوئی آفت آئے تو وہ آفت تمہیں بھی نابود کر دے گی . . . . . ذرا کسی اور سلطنت کے زیر سایہ رہ کر دیکھ لو کہ تم سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ سنو، انگریزی سلطنت تمہارے لیے ایک رحمت ہے، تمہارے لیے ایک برکت ہے، اور خدا کی طرف سے تمہاری وہ سپر ہے۔ پس تم دل و جان سے اس سپر کی قدر کرو۔ اور ہمارے مخالف جو مسلمان ہیں ہزارہا درجہ ان سے انگریز بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں واجب القتل نہیں سمجھتے۔ وہ تمہیں بے عزت نہیں کرنا چاہتے۔" (اپنی جماعت کے لیے ضروری نصیحت از مرزا غلام احمد صاحب، مندرجہ تبلیغ رسالت۔ جلد دہم۔ ص ۱۲۳)

"ایرانی گورنمنٹ نے جو سلوک مرزا علی محمد باب بانی فرقہ بابیہ اور اس کے بیکس مریدوں کے ساتھ محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے کیا اور جو ستم اس فرقے پر توڑے گئے وہ ان دانشمند لوگوں پر مخفی نہیں ہیں جو قوموں کی تاریخ پڑھنے کے عادی ہیں۔ اور پھر سلطنت ٹرکی نے جو ایک یورپ کی سلطنت کہلاتی ہے جو برتاؤ بہاء اللہ بانی فرقہ بابیہ بہائیہ اور اس کے جلاوطن شدہ پیروؤں سے ۱۸۶۳ء سے لے کر ۱۸۹۲ء تک پہلے قسطنطنیہ پھر ایڈریانوپل اور بعد ازاں عکہ کے جیل خانے میں کیا وہ بھی دنیا کے اہم واقعات پر اطلاع رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ دنیا میں تین ہی بڑی سلطنتیں کہلاتی ہیں[1] اور

---

[1] غالباً مسلمانوں کی تین بڑی سلطنتیں مراد ہیں، یعنی ٹرکی، ایران اور افغانستان۔

تینوں نے جو تنگ دلی اور تعصب کا نمونہ اس شائستگی کے زمانے میں دکھایا وہ احمدی قوم کو یہ یقین دلائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ احمدیوں کی آزادی تاج برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ . . . . .

لہٰذا تمام سچے احمدی جو حضرت مرزا صاحب کو مامور من اللہ اور ایک مقدس انسان تصور کرتے ہیں بدون کسی خوشامد اور چاپلوسی کے دل سے یقین رکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ ان کے لیے فضل ایزدی اور سایۂ رحمت ہے اور اس کی ہستی کو وہ اپنی ہستی خیال کرتے ہیں"۔ (الفضل ۱۳ ستمبر ۱۹۱۴ء)

یہ عبارات اپنی زبان سے خود کہہ رہی ہیں کہ کفار کی غلامی، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، مدعیانِ نبوت اور ان کے پیروؤں کے لیے وہی عین رحمت اور فضلِ ایزدی ہے، کیونکہ اسی کے زیر سایہ اِن لوگوں کو اسلام میں نئی نئی نبوتوں کے فتنے اٹھانے اور مسلم معاشرے کی قطع و برید کرنے کی آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اس کے برعکس مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت، جو مسلمانوں کے لیے ایک رحمت ہے، اِن لوگوں کے لیے وہی ایک آفت ہے کیونکہ با اختیار مسلمان بہرحال اپنے ہی دین کی تخریب اور اپنے ہی معاشرے کی قطع و برید کو بخوشی برداشت نہیں کرسکتے۔

اس مستقل رجحان کے علاوہ اب ایک نیا رجحان قادیانی گروہ میں یہ ابھر رہا ہے کہ وہ پاکستان کے اندر ایک قادیانی ریاست کی بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ قیام پاکستان کو ابھی پورا ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو قادیانی خلیفہ صاحب نے کوئٹہ میں ایک خطبہ دیا جو ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے الفضل میں بایں الفاظ شائع ہوا ہے:

"برٹش بلوچستان —— جواب پاکی بلوچستان ہے —— کی کل آبادی پانچ یا چھ لاکھ ہے۔ یہ آبادی اگرچہ دوسرے صوبوں کی آبادی سے کم ہے مگر بوجہ ایک یونٹ ہونے کے اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں جیسے افراد کی قیمت ہوتی ہے یونٹ کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کی کانسٹی ٹیوشن ہے۔ وہاں اسٹیٹس سینٹ کے لیے اپنے ممبر منتخب کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی اسٹیٹ کی آبادی دس کروڑ ہے یا ایک کروڑ ہے۔ سب اسٹیٹس کی طرف سے برابر ممبر لیے جاتے ہیں۔ غرض پاکی بلوچستان کی آبادی ۵-۶ لاکھ ہے اور اگر ریاستی بلوچستان کو ملا لیا جائے

تو اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک یونٹ ہے اس لیے اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زیادہ آبادی کو تو احمدی بنانا مشکل ہے لیکن تھوڑے آدمیوں کو احمدی بنانا کوئی مشکل نہیں۔ پس جماعت اس طرف اگر پوری توجہ دے تو اس صوبے کو بہت جلدی احمدی بنایا جا سکتا ہے۔

. . . . یاد رکھو تبلیغ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہماری (Base) مضبوط نہ ہو۔ پہلے بیس مضبوط ہو تو پھر تبلیغ پھیلتی ہے۔ پس پہلے اپنی (Base) مضبوط کر لو۔ کسی نہ کسی جگہ اپنی (Base) بنالو۔ کسی ملک میں ہی بنالو۔ . . . اگر ہم سارے صوبے کو احمدی بنالیں تو کم از کم ایک صوبہ تو ایسا ہو جائے گا جس کو ہم اپنا صوبہ کہہ سکیں گے اور یہ بڑی آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔"

یہ تقریر کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ دوسرے گروہ جن کی موجودگی کا حوالہ دے کر قادیانیوں کو برداشت کرنے کا ہمیں مشورہ دیا جاتا ہے، کیا ان میں سے بھی کسی کے ایسے منصوبے ہیں؟ کیا ان میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو اپنے مذہب کے لیے غیر مسلم اقتدار کو مفید اور مسلم اقتدار کو غیر مفید سمجھتا ہو، اور مسلم اقتدار قائم ہوتے ہی ریاست کے اندر اپنی ایک ریاست بنانے کی فکر میں لگ گیا ہو؟ اگر نہیں ہے تو پھر ان کی مثال قادیانیوں پر کیوں چسپاں کی جاتی ہے؟

اب تیسرے سوال کو لیجیے، یعنی یہ کہ علٰحدگی کا مطالبہ تو اقلیتیں کیا کرتی ہیں، یہاں یہ کیسی الٹی بات ہو رہی ہے کہ اکثریت اس کا مطالبہ کر رہی ہے۔

یہ سوال جو لوگ چھیڑتے ہیں، کیا براہ کرم ان میں سے کوئی صاحب کسی سیاسی انجیل کی ایسی کوئی آیت پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ قانون کلی بیان کیا گیا ہو کہ علٰحدگی کا مطالبہ کرنا صرف اقلیت ہی کے لیے جائز ہے، اکثریت ایسے کسی مطالبے کو پیش کرنے کی حق دار نہیں ہے؟ ہمیں بتایا جائے کہ یہ اصول کہاں لکھا ہے اور کس نے اسے مقرر کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مطالبات ہمیشہ ضرورت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں اور وہی ان کو پیش کرتا ہے جسے ان کی

ضرورت ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ایک مطالبہ جس ضرورت کی بنا پر پیش کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ یہاں اختلاط کا نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے نہ کہ اقلیت کو۔ اس لیے اکثریت یہ مطالبہ کرنے پر مجبور ہوئی ہے کہ اُس اقلیت کو آئینی طور پر الگ کر دیا جائے جو ایک طرف عملاً الگ ہو کر علٰحدگی کا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے اور دوسری طرف اکثریت کا جزء بن کر اختلاط کے فوائد بھی سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں سے مذہبی معاشرتی تعلقات منقطع کر کے اپنی الگ جتھہ بندی کرتی ہے اور منظم طریقے سے اُن کے خلاف ہر میدان میں کشمکش کرتی ہے، دوسری طرف مسلمانوں میں مسلمان بن کر گھستی ہے، اپنی تبلیغ سے اپنی تعداد بڑھاتی ہے، مسلم معاشرے میں تفریق کا فتنہ برپا کرتی ہے، اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے تناسب حصے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ حصہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس صورتِ حال کا سراسر نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے اور بالکل ناجائز فائدہ اقلیت حاصل کر رہی ہے۔ پھر آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ ایسے حالات میں اگر اقلیت علٰحدگی کا مطالبہ نہیں کرتی تو اسے زبردستی اکثریت کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے بٹھائے رکھا جائے اور اکثریت کے مطالبہ علٰحدگی کو رد کر دیا جائے؟

علٰحدگی کے اسباب اکثریت نے نہیں بلکہ خود اقلیت نے پیدا کیے۔ عملاً اپنا الگ معاشرہ اُس نے خود بنایا۔ اکثریت سے مذہبی و معاشرتی روابط اس نے خود توڑے۔ اس روش کا فطری تقاضا یہ تھا کہ وہ خود اُس علٰحدگی کو تسلیم کر لیتی جو اس نے فی الواقع اختیار کی ہے۔ اسے اگر تسلیم کرنے سے وہ گریز کرتی ہے تو یہ اس سے پوچھیے کہ کیوں گریز کرتی ہے۔ اور خدا نے آپ کو دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں تو خود دیکھیے کہ آخر اپنے ہی عمل کے لازمی نتائج قبول کرنے سے اسے کیوں گریز ہے۔ اس کی نیت اگر دغا اور فریب سے کام چلانے کی ہے تو آپ کی عقل کہاں چلی گئی ہے کہ آپ خود اپنی قوم کو اس دغا بازی کا شکار بنانے پر تلے ہوئے ہیں؟

آخری جواب طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ قادیانی حضرات اسلام کی مدافعت اور تبلیغ کرتے رہے ہیں اس لیے ان سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

یہ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جس میں بالعموم ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگ بُری طرح

بتلاتے ہیں۔ اس لیے ہم ان سے گذارش کرتے ہیں کہ ذرا آنکھیں کھول کر مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی حسب ذیل عبارتوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ عبارتیں اس مذہب کے بانی کی نیت اور مقاصد کو خود ہی بڑی خوبی کے ساتھ بیان کر رہی ہیں۔

"تریاق القلوب" مطبوعہ مطبع ضیاء الاسلام قادیان (۲۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء) ضمیمہ نمبر ۳ بعنوان "حضور گورنمنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست" میں مرزا غلام احمد صاحب لکھتے ہیں:-

"بیس برس کی مدت سے میں اپنے دلی جوش سے ایسی کتابیں زبان فارسی اور عربی اور اردو اور انگریزی میں شائع کر رہا ہوں جن میں بار بار یہ لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے جس کے ترک سے وہ خداتعالیٰ کے گنہگار ہونگے کہ اس گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ اور دلی جاں نثار ہو جائیں اور جہاد اور خونی مہدی کے انتظار وغیرہ بیہودہ خیالات سے جو قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتے دست بردار ہو جائیں اور اگر وہ اس غلطی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو کم سے کم یہ ان کا فرض ہے کہ اس گورنمنٹ محسنہ کے ناشکر گذار نہ بنیں اور نمک حرامی سے خدا کے گنہگار نہ ٹھیریں۔" (ص ۳۰۷)

آگے چل کر پھر اسی عاجزانہ درخواست میں لکھتے ہیں:-

"اب میں اپنی گورنمنٹ محسنہ کی خدمت میں جرأت سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ بست سالہ میری خدمت ہے جس کی نظیر برٹش انڈیا میں ایک بھی اسلامی خاندان پیش نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قدر لمبے زمانہ تک جو بیس برس کا زمانہ ہے ایک مسلسل طور پر تعلیم مذکورۂ بالا پر زور دیتے جانا کسی منافق اور خود غرض کا کام نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کا کام ہے جس کے دل میں اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی ہے۔ ہاں میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نیک نیتی سے دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مباحثات بھی کیا کرتا ہوں اور ایسا ہی پادریوں کے مقابل پر بھی مباحثات کی کتابیں شائع کرتا رہا ہوں اور میں اس بات کا بھی اقراری ہوں کہ جبکہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہو گئی اور حد اعتدال سے بڑھ گئی اور بالخصوص پرچہ نور افشاں میں جو ایک عیسائی اخبار لدھیانہ سے نکلتا ہے نہایت گندی تحریریں شائع ہوئیں اور ان مؤلفین نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت نعوذ باللہ

ایسے الفاظ استعمال کیے کہ یہ شخص ڈاکو تھا، چور تھا، زنا کار تھا، اور صدہا پرچوں میں یہ شائع کیا کہ یہ شخص اپنی لڑکی پر بدنیتی سے عاشق تھا اور باایں ہمہ جھوٹا تھا اور لوٹ مار اور خون کرنا اس کا کام تھا تو مجھے ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے یہ اندیشہ دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا کوئی سخت استعمال دینے والا اثر پیدا ہو تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کو دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تا سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بدامنی پیدا نہ ہو تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدزبانی کی گئی تھی چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں کسی قدر بالمقابل سختی تھی کیونکہ میرے کانشنس نے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش رکھنے والے آدمی موجود ہیں ان کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے کے لیے یہ طریق کافی ہوگا۔" (صفحہ ۳۰۸-۳۰۹)

پھر چند سطور کے بعد لکھتے ہیں :-

"سو مجھ سے پادریوں کے مقابل پر جو کچھ وقوع میں آیا یہی ہے کہ حکمت عملی سے بعض وحشی مسلمانوں کو خوش کیا گیا اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں تمام مسلمانوں میں سے اوّل درجے کا خیر خواہ گورنمنٹ انگریزی کا ہوں کیونکہ مجھے تین باتوں نے خیر خواہی میں اول درجے پر بنا دیا ہے (۱) اول والد مرحوم کے اثر نے (۲) دوم اس گورنمنٹ عالیہ کے احسانوں نے (۳) تیسرے خدا تعالیٰ کے الہام نے۔" (صفحہ ۳۰۹-۳۱۰)

"شہادۃ القرآن" مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ طبع ششم کے ساتھ ایک ضمیمہ ہے جس کا عنوان ہے "گورنمنٹ کی توجہ کے لائق"۔ اس میں مرزا صاحب لکھتے ہیں :-

"سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں۔ دوسرے اُس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو، جس نے ظالموں کے

ہاتھ سے اپنے سائے میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔" (ص ۳۳)

"تبلیغ رسالت" جلد ہفتم مطبوعہ فاروقی پریس قادیان (اگست ۱۹۲۲ء) میں مرزا صاحب کی ایک درخواست بحضور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ" درج ہے جس میں وہ پہلے اپنے خاندان کی وفاداریوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ چٹھیاں نقل کرتے ہیں جو ان کے والد مرزا غلام مرتضیٰ خاں کو کمشنر لاہور، فنانشل کمشنر پنجاب اور دوسرے انگریز افسروں نے ان کی وفادارانہ خدمات کے اعتراف میں عطا کی تھیں۔ نیز ان خدمات کو گنایا ہے جو ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے انجام دیں۔ پھر لکھتے ہیں:۔

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ تا مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں" (ص ۱۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اور میں نے نہ صرف اسی قدر کام کیا کہ برٹش انڈیا کے مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی اطاعت کی طرف جھکایا بلکہ بہت سی کتابیں عربی اور فارسی اور اردو میں تالیف کر کے ممالک اسلامیہ کے لوگوں کو بھی مطلع کیا کہ ہم لوگ کیونکر امن اور آرام اور آزادی سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے ہیں" (ص ۱۰)

پھر وہ اپنی ان کتابوں کی ایک لمبی فہرست دیتے ہیں جن سے ان کی وفادارانہ خدمات کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

"گورنمنٹ تحقیق کرے کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہزاروں مسلمانوں نے جو مجھے کافر قرار دیا اور مجھے اور میری جماعت کو جو ایک گروہ کثیر پنجاب اور ہندوستان میں موجود ہے ہر ایک طور کی بدگوئی اور بداندیشی سے ایذا دینا اپنا فرض سمجھا اس تکفیر اور ایذا کا ایک مخفی سبب یہ ہے کہ ان نادان مسلمانوں کے پوشیدہ خیالات کے برخلاف دل و جان سے گورنمنٹ انگلشیہ کی شکرگزاری کے لیے

ہزار ہا اشتہارات شائع کیے گئے اور ایسی کتابیں بلاد عرب و شام وغیرہ تک پہنچائی گئیں؛ یہ باتیں بے ثبوت نہیں۔ اگر گورنمنٹ توجہ فرماوے تو نہایت بدیہی ثبوت میرے پاس ہیں۔ میں زور سے کہتا ہوں اور میں دعویٰ سے گورنمنٹ کی خدمت میں اعلان دیتا ہوں کہ باعتبار مذہبی اصول کے مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے گورنمنٹ کا اول درجے کا وفادار اور جاں نثار یہی نیا فرقہ ہے جس کے اصولوں میں سے کوئی اصول گورنمنٹ کے لیے خطرناک نہیں" (ص ۱۳)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:۔

"اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے" (ص ۱۷)

تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو نظر انداز کر دیجیے کہ یہ زبان اور یہ تحریر کسی نبی کی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں ہم یہاں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اس مذہب کی تبلیغ و تلقین اور مدافعت اسلام کے وہ مقاصد اور محرکات ہیں جو بانی مذہب نے خود بیان کیے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ نام نہاد "خدمت دین" کسی قدر کی مستحق رہ جاتی ہے؟ اس پر بھی اگر کوئی شخص اس خدمت دین کی حقیقت نہ سمجھ سکے تو ہم اس سے گذارش کریں گے کہ ذرا قادیانیوں کے اپنے ان اعترافات کو آنکھیں کھول کر پڑھے:۔

"عرصہ دراز کے بعد اتفاقاً ایک لائبریری میں ایک کتاب ملی جو چھپ کر نایاب بھی ہو گئی تھی اس کتاب کا مصنف ہے ایک اطالوی انجینئر جو افغانستان میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ صاحبزادہ عبداللطیف صاحب (قادیانی) کو اس لیے شہید کیا گیا کہ وہ جہاد کے خلاف تعلیم دیتے تھے اور حکومت افغانستان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس سے افغانوں کا جذبہ حریت کمزور ہو جائے گا اور ان پر انگریزوں کا اقتدار چھا جائے گا ...... ایسے معتبر راوی کی روایت سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اگر صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہید خاموشی سے بیٹھے رہتے اور جہاد کے خلاف کوئی لفظ بھی نہ کہتے تو حکومت افغانستان کو انہیں شہید کرنے کی ضرورت محسوس

نہ ہوتی" (مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کا خطبہ جمعہ مندرجہ الفضل مورخہ ۶ راگست ۱۹۳۵ء)

"افغان گورنمنٹ کے وزیر داخلیہ نے مندرجۂ ذیل اعلان شائع کیا ہے: کابل کے دو اشخاص ملا عبدالحلیم چہار آسیائی و ملا نور علی دکاندار قادیانی عقائد کے گرویدہ ہو چکے تھے اور لوگوں کو اس عقیدہ کی تلقین کر کے انہیں اصلاح کی راہ سے بھٹکا رہے تھے . . . . ان کے خلاف مدت سے ایک اور دعویٰ دائر ہو چکا تھا اور مملکتِ افغانیہ کے مصالح کے خلاف غیر ملکی لوگوں کے سازشی خطوط ان کے قبضے سے پائے گئے جن سے پایا جاتا ہے کہ وہ افغانستان کے دشمنوں کے ہاتھ بک چکے تھے۔" (اخبار الفضل بحوالہ امان افغان۔ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۲۵ء)

"روسیہ (یعنی روس) میں اگرچہ تبلیغ احمدیت کے لیے گیا تھا لیکن چونکہ سلسلہ احمدیہ اور برٹش حکومت کے باہمی مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لیے جہاں میں اپنے سلسلے کی تبلیغ کرتا تھا وہاں لازماً مجھے گورنمنٹ انگریزی کی خدمت گذاری بھی کرنی پڑتی تھی" (بیان محمد امین صاحب قادیانی مبلغ۔ مندرجہ اخبار الفضل مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء)

"دنیا ہمیں انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتی ہے، چنانچہ جب جرمنی میں احمدیہ عمارت کے افتتاح کی تقریب میں ایک جرمن وزیر نے شمولیت کی تو حکومت نے اس سے جواب طلب کیا کہ کیوں تم ایسی جماعت کی کسی تقریب میں شامل ہوئے جو انگریزوں کی ایجنٹ ہے۔" (خلیفۂ قادیان کا خطبۂ جمعہ مندرجہ اخبار الفضل مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۴ء)

"ہمیں امید ہے کہ برٹش حکومت کی توسیع کے ساتھ ہمارے لیے اشاعتِ اسلام کا میدان بھی وسیع ہو جائے گا اور غیر مسلم کو مسلم بنانے کے ساتھ ہم مسلمان کو پھر مسلمان کریں گے" (لارڈ ہارڈنگ کی سیاحتِ عراق پر اظہارِ خیال۔ مندرجہ الفضل ۱۱ر فروری ۱۹۱۰ء)

"فی الواقع گورنمنٹ برطانیہ ایک ڈھال ہے جس کے نیچے احمدی جماعت آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس ڈھال کو ذرا ایک طرف کر دو اور دیکھو کہ زہریلے تیروں کی کیسی خطرناک بارش تمہارے سروں پر ہوتی ہے۔ پس کیوں ہم اس گورنمنٹ کے شکر گذار نہ ہوں۔ ہمارے فوائد اس

گورنمنٹ سے متحد ہو گئے ہیں اور اس گورنمنٹ کی تباہی ہماری تباہی ہے اور اس گورنمنٹ کی ترقی ہماری ترقی۔ جہاں جہاں اس گورنمنٹ کی حکومت پھیلتی جاتی ہے، ہمارے لیے تبلیغ کا ایک میدان نکلتا آتا ہے" (الفضل ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

"سلسلۂ احمدیہ کا گورنمنٹ برطانیہ سے جو تعلق ہے وہ باقی تمام جماعتوں سے نرالا ہے۔ ہمارے حالات ہی اس قسم کے ہیں کہ گورنمنٹ اور ہمارے فوائد ایک ہو گئے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کی ترقی کے ساتھ ہمیں بھی آگے قدم بڑھانے کا موقع ملتا ہے اور اس کو خدانخواستہ اگر کوئی نقصان پہنچے تو اس صدمے سے ہم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے" (خلیفہ قادیان کا اعلان مندرجہ اخبار الفضل، ۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء)

اب قادیانی جماعت کی پوری تصویر آپ کے سامنے ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال یہ ہیں:-

(۱) پچاس برس سے زیادہ مدت ہوئی، جب کہ انگریزی دورِ حکومت میں مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، پنجاب میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھا۔ جس قوم کو اللہ کی توحید اور رسالتِ محمدی کے اقرار نے ایک قوم، ایک ملت اور ایک معاشرہ بنایا تھا اس کے اندر اس شخص نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان ہونے کے لیے توحید و رسالتِ محمدی پر ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ میری نبوت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اور جو اس پر ایمان نہ لائے وہ توحید و رسالتِ محمدی پر ایمان رکھنے کے باوجود کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

(۲) اس بنیاد پر اس نے مسلم معاشرے میں کفر و ایمان کی نئی تفریق پیدا کی اور جو لوگ اس پر ایمان لائے ان کو مسلمانوں سے الگ ایک امت اور ایک معاشرے کی شکل میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس نئی امت اور مسلمانوں کے درمیان اعتقاداً اور عملاً ویسی ہی جدائی پڑ گئی جیسی ہندوؤں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تھی۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نہ عقیدے میں شریک رہی، نہ عبادت میں، نہ رشتے ناتے میں، اور نہ شادی و غم میں۔

(۳) بانی مذہب کو اول روز سے یہ احساس تھا کہ مسلم معاشرہ اپنی اس قطع و برید کو بخوشی برداشت نہیں

کر یگا اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے اور اس کے جانشینوں نے نہ صرف ایک پالیسی کے طور پر انگریزی حکومت کی پختہ وفاداری و خدمت گزاری کا رویہ اختیار کیا بلکہ عین اپنے موقف کے فطری تقاضے سے ہی انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کا مفاد لازماً غلبۂ کفر کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں نہیں، تمام دنیا میں اس بات کے خواہشمند رہے اور عملاً اس کے لیے کوشاں رہے کہ آزاد مسلمان قومیں بھی انگریزوں کی غلام ہو جائیں تاکہ ان میں اس نئے مذہب کی اشاعت کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

(۴) اس طرح بیرونی اقتدار سے گٹھ جوڑ کر کے اس جماعت نے مسلمانوں کی اُن تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا جو گذشتہ نصف صدی میں اُسے مسلمانوں سے خارج کرنے کے لیے کی گئیں اور انگریزی حکومت اس بات پر مُصر رہی کہ یہ گروہ مسلمانوں سے الگ، بلکہ ہر چیز میں اُن کا مخالف ہونے کے باوجود انہی میں شامل رہیگا۔ اس تدبیر سے مسلمانوں کو دُہرا نقصان اور قادیانی جماعت کو دُہرا فائدہ پہنچایا گیا:-

(الف) عام مسلمانوں کو علماء کی تمام کوششوں کے باوجود یہ باور کرایا جاتا رہا کہ قادیانیت اسلام ہی کا ایک فرقہ اور قادیانی گروہ مسلم معاشرے ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح قادیانیت کے لیے مسلمانوں میں پھیلنا زیادہ آسان ہو گیا کیونکہ اس صورت میں ایک مسلمان کو قادیانیت اختیار کرتے ہوئے یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے نکل کر کسی دوسرے معاشرے میں جا رہا ہے۔ قادیانیوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ وہ مسلمانوں میں سے برابر آدمی توڑ توڑ کر اپنی تعداد بڑھاتے رہے۔ اور مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچا کہ ان کے معاشرے میں ایک بالکل الگ اور مخالف معاشرہ سرطان کی طرح اپنی جڑیں پھیلاتا رہا جس کی بدولت ہزارہا خاندانوں میں تفرقے برپا ہو گئے۔ خصوصیت کے ساتھ پنجاب اس کا سب سے زیادہ شکار ہوا کیونکہ یہ بلا اسی صوبے سے اٹھی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ آج پنجاب ہی کے مسلمان اس کے خلاف سب سے بڑھ کر مشتعل ہیں۔

(ب) انگریزی حکومت کی منظورِ نظر بن کر قادیانی جماعت انگریزی حکومت کی فوج، پولیس، عدالت اور دوسری سرکاری ملازمتوں میں اپنے آدمی دھڑا دھڑ بھرتی کراتی چلی گئی۔ اور یہ سب کچھ اس نے مسلمان بن کر ملازمتوں کے اُس کوٹے سے حاصل کیا جو مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا رہا کہ یہ ملازمتیں تم کو مل رہی ہیں، حالانکہ وہ بڑی کثیر تعداد میں اُن قادیانیوں کو دی جا رہی تھیں جو مسلمانوں

(باقی صفحہ ۳۵۹ پر)

تفہیم القرآن

مریم

نام | اس سورۃ کا نام آیت وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں مریم کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کا زمانۂ نزول ہجرت حبشہ سے پہلے کا ہے۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین اسلام جب نجاشی کے دربار میں بلائے گئے تھے اس وقت حضرت جعفر نے یہی سورۃ بھرے دربار میں تلاوت کی تھی۔

تاریخی پس منظر | جس دور میں یہ سورہ نازل ہوئی اس کے حالات کی طرف ہم کسی حد تک سورۂ کہف کے دیباچے میں اشارہ کر چکے ہیں، لیکن وہ مختصر اشارہ اس سورے کو اور اس دور کی دوسری سورتوں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے ہم ذرا اس وقت کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

قریش کے سردار جب تضحیک، استہزاء، اطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریک اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے ظلم و ستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے اپنے قبیلے کے نومسلموں کو تنگ پکڑا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دے کر، حتیٰ کہ سخت جسمانی اذیتیں دے دے کر انہیں اسلام چھوڑنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور موالی جو قریش والوں کے تحت زیردست کی حیثیت سے رہتے تھے، بری طرح پیسے گئے۔ مثلاً بلال، عامر بن فہیرہ، ام عُبَیس، زِنِّیرہ، عمار بن یاسر اور ان کے والدین وغیرہم۔ ان لوگوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکے کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔

جو لوگ پیشہ ور تھے ان سے کام لے لیا جاتا اور اجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت خباب بن ارت کی یہ روایت موجود ہے کہ :-

"میں مکے میں لوہار کا کام کرتا تھا۔ مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اجرت نہ دوں گا جب تک تو محمد کا انکار نہ کرے"

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوششیں کی جاتیں اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے اُن کو ہر طریقے سے ذلیل و رسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خباب کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ، اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے۔ آپ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک تمتما اٹھا اور آپ نے فرمایا "تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے اُن پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو" (بخاری)

یہ حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ فان بہا ملکا لا یُظلم عندہ احد وھی ارض صدق حتی یجعلکم اللہ لکم فرجا مما انتم فیہ "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو"

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعیبیہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۳ مرد، گیارہ عورتیں اور

ے غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سلمہ بن ہشام، اس کے چچا زاد بھائی ہشام بن ابی حذیفہ اور عیاش بن ابی ربیعہ اور اس کی چچا زاد بہن حضرت ام سلمہ، ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ، عتبہ کے بیٹے اور ہندِ جگر خوار کے سگے بھائی ابوحذیفہ، سہیل بن عمرو کی بیٹی سہلہ، اور اسی طرح دوسرے سرداران قریش اور مشہور دشمنان اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اسی لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعے سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخر کار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعے سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰ بنت ابی حثمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی، اور میرے شوہر عامر بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے "عبداللہ کی ماں، جا رہی ہو؟" میں نے کہا "ہاں، خدا کی قسم تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا۔ خدا کی زمین کھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔" یہ سن کر عمر کے چہرے پر رقت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے، اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ "خدا تمہارے ساتھ ہو۔"

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ نے (جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیان سلطنت میں خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی

پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو پیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ "ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آگئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے" ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہل دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ "ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔" مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ "اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔" چنانچہ نجاشی نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے وہی ہم بے کم و کاست پیش کریں گے خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا؟" اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفر بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر ان مظالم کا ذکر کیا جو آنحضور کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رخ اس امید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے نبی پر اترا ہے۔ حضرت جعفر نے جواب میں سورہ مریم

کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالہ نہ کروں گا۔"

دوسرے روز عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عمرو کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحاب رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسول نے سکھائی۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اٹھ کر بلا تامل کہا کہ ھو عبد اللہ ورسولہ وروحہ وکلمتہ القاھا الی مریم العذراء البتول۔ "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا" نجاشی نے سن کر ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اُس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے" اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ "میں رشوت نہیں لیتا" اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

موضوع اور مضمون | اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اس سورۃ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اولین بات نمایاں ہو کر ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زاد راہ کے طور

پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی تا کہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

پہلے دو رکوعوں میں حضرت یحییٰ اور عیسیٰؑ کا قصّہ سنانے کے بعد پھر تیسرے رکوع میں حالاتِ زمانہ کی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا قصہ سنایا گیا ہے کیونکہ ایسے ہی حالات میں وہ بھی اپنے باپ اور خاندان اور اہلِ ملک کے ظلم سے تنگ آ کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے ایک طرف کفار مکہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان ابراہیمؑ کی پوزیشن میں ہیں اور تم لوگ ان ظالموں کی پوزیشن میں ہو جنہوں نے تمہارے باپ اور پیشوا، ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام وطن سے نکل کر تباہ نہ ہوئے بلکہ اور زیادہ سربلند ہو گئے ایسا ہی انجام نیک تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

اس کے بعد چوتھے رکوع میں دوسرے انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، مگر انبیاء کے گزر جانے کے بعد ان کی امتیں بگڑتی رہی ہیں اور آج مختلف امتوں میں جو گمراہیاں پائی جا رہی ہیں یہ اسی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔

آخری دو رکوعوں میں کفار مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ دشمنانِ حق کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

اللہ کے نام سے، جو رحمٰن اور رحیم ہے

ک، ہ، ی، ع، ص۔ ذکر[1] ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا[2] پر کی تھی،

---

[1] تقابل کے لیے سورہ آل عمران رکوع ۴ پیشِ نظر رہے جس میں یہ قصہ دوسرے الفاظ میں بیان ہو چکا ہے۔

[2] یہ حضرت زکریا جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے حضرت ہارون کے خاندان سے تھے۔ ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے نظامِ کہانت (Priesthood) کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے (باقی صفحہ ۳۱)

جبکہ اُس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔
اُس نے عرض کیا "اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھُل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ اَے پروردگار، میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی برائیوں کا خوف ہے،[1] اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوب کی میراث بھی پائے،[2] اور اَے پروردگار، اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔"
(جواب دیا گیا) "اے زکریا، ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اِس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔"[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸) فلسطین پر قابض ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوب کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا، اور تیرھواں قبیلہ (یعنی لاوی بن یعقوب کا گھرانا) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی اصل وہ خاندان جو "مقدس میں خداوند کے آگے بخور جلانے کی خدمت" اور "پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام" کرتا تھا، حضرت ہارون کا خاندان تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوی مقدس کے اندر نہیں جا سکتے تھے بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھریوں میں کام کرتے تھے، سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے، اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مقدس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انہی خاندانوں میں سے ایک ابیاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریا تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مقدس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب تواریخ اول۔ باب ۲۳ و ۲۴)

[1] مطلب یہ ہے کہ ابیاہ کے خاندان میں میرے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دینی اور اخلاقی حیثیت سے اس منصب کا اہل ہو جسے میں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آگے جو نسل اُٹھتی نظر آ رہی ہے اس کے لچھن بگڑے ہوئے ہیں۔

[2] یعنی مجھے صرف اپنی ذات ہی کا وارث مطلوب نہیں ہے بلکہ خانوادۂ یعقوب کی بھلائیوں کا وارث مطلوب ہے۔

[3] لوقا کی انجیل میں الفاظ یہ ہیں: "تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں" (۱: ۶۱)

عرض کیا، "پروردگار، بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں؟"

جواب ملا "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا۔"[1]

زکریا نے کہا، "پروردگار، میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔"

فرمایا "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔"

چنانچہ وہ محراب[2] سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔[3]

---

[1] حضرت زکریا کے اس سوال اور فرشتے کے جواب کو نگاہ میں رکھیے، کیونکہ آگے چل کر حضرت مریم کے قصے میں پھر یہی مضمون آرہا ہے اور اس کا جو مفہوم یہاں ہے وہی وہاں بھی ہونا چاہیے۔ حضرت زکریا نے کہا کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ "ایسا ہی ہوگا" یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود تیرے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حوالہ دیا کہ جس خدا نے تجھے نیست سے ہست کیا اس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تجھ جیسے شیخ فانی سے ایک ایسی عورت کے ہاں اولاد پیدا کر دے جو عمر بھر بانجھ رہی ہے۔

[2] محراب کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران حاشیہ ۳۶

[3] اس واقعے کی جو تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان ہوئی ہیں انہیں ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے قرآن کی روایت کے ساتھ مسیحی روایت بھی رہے۔ درمیان میں قوسین کی عبارتیں ہماری اپنی ہیں:۔

"یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں (ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ نمبر ۹) ابیاہ کے فریق سے زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع (Elizabeth) تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب

(باقی ۳۲۱ پر)

"اے یحییٰ، کتابِ الٰہی کو مضبوط تھام لے"

(بقیہ حاشیہ ۲۲) وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مَقدِس میں جاکر خوشبو جلائے۔ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی دہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی۔ مگر فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا! خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سن لی گئی (حضرت زکریا کی دعا کا ذکر بائیبل میں کہیں نہیں ہے) اور تیرے لیے تیری بیوی الیشبع کے بیٹا ہوگا۔ تو اس کا نام یوحنا (یعنی یحییٰ) رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہونگے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا (سورۂ آلِ عمران میں اس کے لیے لفظ سیّدًا استعمال ہوا ہے) اور ہرگز نہ مے اور نہ کوئی اور شراب پیئے گا (حَنَانًا) اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائیگا (وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا) اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا۔ اور وہ ایلیاہ (الیاس علیہ السلام) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے"

"زکریاہ نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بڈھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے اس سے کہا میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں۔ اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہیگا اور بول نہ سکیگا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہونگی یقین نہ کیا۔ (یہ بیان قرآن سے مختلف ہے۔ قرآن اسے نشانی قرار دیتا ہے اور لوقا کی روایت اسے سزا کہتی ہے نیز قرآن صرف تین دن کی خاموشی کا ذکر کرتا ہے اور لوقا کہتا ہے کہ اس وقت سے حضرت یحییٰ کی پیدائش تک حضرت زکریا گونگے رہے) اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا" (لوقا۔ باب ۱۔ آیت ۵ تا ۲۲)

ؔ یہ حاشیہ ۲۳ پر دیکھیں

ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم[۱] سے نوازا، اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی[۲] اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ نہ جبار تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اُس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے[۳] ع

(حاشیہ سلہ صفحہ سابق) یہاں صرف ایک فقرے میں اُس مشن کو بیان کر دیا گیا جو منصب نبوت پر مامور کرتے وقت ان کے سپرد کیا گیا تھا یعنی وہ توراۃ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور بنی اسرائیل کو اس پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔

[۱] "حکم" یعنی قوت فیصلہ، قوتِ اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت۔

[۲] اصل میں لفظ حنان استعمال ہوا ہے جو قریب قریب ماتا کا ہم معنی ہے یعنی ایک ماں کو جو غایت درجے کی شفقت اپنی اولاد پر ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہے، وہ شفقت حضرت یحییٰ کے دل میں بندگانِ خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

[۳] حضرت یحییٰ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرت پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے سورہ آل عمران اور اس سورے کے مختصر اشارات کی توضیح ہو گی۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ اُن کی والدہ اور حضرت عیسیٰ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے اور یوحنا کی روایت کے مطابق انہوں نے شرق اردن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے :۔

"میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو" (یوحنا ۱ : ۲۳)

مرقس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے، یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے (مرقس ۱ : ۴-۵)۔ اسی بنا پر ان کا نام یوحنا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے (متی ۲۱ : ۲۶)۔ مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا" (متی ۱۱ : ۱۱)

وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد[?] پر

اور اے محمدؐ! اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب

(بقیہ حاشیہ ۳۲) اور جنگلی شہد تھا (متی ۳:۴)۔ اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے" (متی ۳:۲)، یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ (آل عمران: ۳۹) وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی ۹:۱۴۔ لوقا ۵:۳۳۔ لوقا ۱۱:۱)۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کُرتے ہوں وہ اُس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔" محصول لینے والوں نے پوچھا کہ استاد ہم کیا کریں تو انہوں نے فرمایا "جو تمہارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا "نہ کسی پر ظلم کرو، اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو، اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔" (لوقا ۳:۱۰-۱۴) بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور صدوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا "اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟ ... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے ... اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔" (متی ۳:۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راستباز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اُس کی بیٹی نے خوب رقص کیا جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے۔ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا (باقی ۳۲ پر)

یہ حاشیہ ۳۲ پر دیکھیں۔

گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی[1]۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا ہے۔

مریم یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔

اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔

مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔

فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں[2] اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔

(بقیہ حاشیہ ۳۲۳) مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرودیس سن کر بہت غمگین ہوا، مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رد کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰ علیہ السلام کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا (متی ۱۴: ۳-۱۲۔ مرقس ۶: ۱۷-۲۹۔ لوقا ۳: ۱۹-۲۰)

[1] (حاشیہ ۳۲۴) تقابل کے لیے سورۂ آل عمران رکوع ۵، ۶ مع حواشی، اور سورۂ نساء حاشیہ ۱۹۰ پیش نظر رہیں۔

[1] سورۂ آل عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المقدس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریا نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریم بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہو گئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریم معتکف تھیں بیت المقدس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انہوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائیبل کی موافقت کی خاطر مکاناً شرقیاً سے مراد ناصرہ لیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

[2] جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، حضرت مریم کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا"، ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اوپر انہی الفاظ میں حضرت زکریا کا استعجاب (باقی ۳۲۵ پر)

اور یہ کام ہو کر رہنا ہے"۔

مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی[1]۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"[2]۔ فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ

(بقیہ حاشیہ ۳۲۴) نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ علاوہ بریں اگر کذٰلک کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہو گا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔

[1] دور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔

[2] ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انہیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔

رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی[1]۔"

پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے "اے مریم! یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن[2]! نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے۔ (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چُپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)۔

[2] ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں ظاہری معنی میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریم کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مضر کے بھائی)، اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ہمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریم کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارون ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انہوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل

(باقی ص ۳۳ پر)

مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔

لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟"

بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں[۱۷]"۔

یہ ہے عیسیٰ ابن مریم اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے[۱۸]۔

(بقیہ حاشیہ ۱۶) اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے"۔ حضور کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

۱۷ یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔

۱۸ یہاں تک جو بات عیسائیوں کے سامنے واضح کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (باقی صفحہ ۳۴۸ پر)

(اور عیسیٰ نے کہا تھا کہ) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے[1]"۔ مگر پھر مختلف گروہ[2] باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے وہ وقت بڑی تباہی کا ہوگا جبکہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اُس روز تو اُن کے کان بھی خوب سُن رہے ہونگے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہونگی مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے محمدؐ، اِس حالت میں جبکہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں، انہیں اُس دن سے ڈرا دو جبکہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ آخر کار ہم ہی زمین اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہونگے اور سب ہماری طرف ہی پلٹائے جائیں گے[3]۔ ع

(بقیہ حاشیہ ۲۲) کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰ کی پیدائش نے اُن کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا اُسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انہیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ، دونوں ایک ایک طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن ہی کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے لیکن یہ عیسائیوں کا غلو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو خدا کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔

[1] یہاں عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام دوسرے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور انہیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمہاری اپنی ایجاد ہے۔ تمہارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران حاشیہ ۶۸ اور سورۂ مائدہ حاشیہ ۱۰۱)

[2] یعنی عیسائیوں کے گروہ

[3] یہاں وہ تقریر ختم ہوتی ہے جو عیسائیوں کو سنانے کے لیے نازل فرمائی گئی تھی۔ اس تقریر کی (باقی صفحہ ۳۴۶ پر)

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو،۱؎ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ (انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابا جان! آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں۲؎، شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ ابا جان! مجھے ڈر ہے کہ

(بقیہ صفحہ ۳۲۸) عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اس کو پڑھتے وقت وہ تاریخی پس منظر نگاہ میں رکھے جو ہم نے اس سورے کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ یہ تقریر اُس موقع پر نازل ہوئی تھی جبکہ مکے کے مظلوم مسلمان ایک عیسائی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے جا رہے تھے، اور اس غرض کے لیے نازل کی گئی تھی کہ جب وہاں مسیح کے متعلق اسلامی عقائد کا سوال چھڑے تو یہ "سرکاری بیان" عیسائیوں کو سنا دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کسی حال میں بھی حق و صداقت کے معاملے میں مداہنت برتنا نہیں سکھایا ہے۔ پھر وہ سچے مسلمان جو حبش کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، اُن کی قوتِ ایمانی بھی حیرت انگیز ہے کہ انہوں نے عین دربارِ شاہی میں ایسے نازک موقع پر اٹھ کر یہ تقریر سنا دی جبکہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر انہیں نکلوا دینے پر تل گئے تھے۔ اس وقت اس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا یہ بے لاگ تبصرہ سن کر نجاشی بھی بگڑ جائے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قصائیوں کے حوالے کر دیگا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ کیا۔

۱؎ یہاں سے خطاب کا رُخ اہلِ مکہ کی طرف پھر رہا ہے جنہوں نے اپنے نوجوان بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو اُسی طرح خدا پرستی کے جرم میں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو ان کے باپ اور بھائی بندوں نے دیس نکالا دیا تھا۔ اس غرض کے لیے دوسرے انبیاء کو چھوڑ کر خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے قصے کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ قریش کے لوگ ان کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور انہی کی اولاد ہونے پر عرب میں اپنا فخر جتایا کرتے تھے۔

۲؎ اصل الفاظ ہیں لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ، یعنی "شیطان کی عبادت نہ کریں۔" اگرچہ حضرت ابراہیمؑ (باقی صفحہ ۳۳۲ پر)

کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"

باپ نے کہا "ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔"

ابراہیم نے کہا "سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔"

پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے الگ ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحٰق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی نام وری عطا کی۔[ع] ع

(بقیہ حاشیہ ۲۴۹) کے والد اور قوم کے دوسرے لوگ عبادت بتوں کی کرتے تھے، لیکن چونکہ اطاعت وہ شیطان کی کر رہے تھے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی اس اطاعتِ شیطان کو بھی عبادتِ شیطان قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت محض پوجا اور پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتے ہوئے بھی اس کی بندگی بجا لائے تو وہ اس کی عبادت کا مجرم ہے، کیونکہ شیطان بہر حال کسی زمانے میں بھی لوگوں کا "معبود" (بمعنی معروف) نہیں رہا ہے بلکہ اس کے نام پر ہر زمانے میں لوگ لعنت ہی بھیجتے رہے ہیں۔

لہ یہ حرفِ تسلی ہے ان مہاجرین کے لیے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح ابراہیم اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اُلٹے سربلند و سرفراز ہو کر رہے اسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے بلکہ وہ عزت پاؤ گے جس کا تصور بھی جاہلیت میں پڑے ہوئے کفارِ قریش نہیں کر سکتے۔

تزکیۂ نفس

دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت

(مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد اگر یہ سوال کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا اصلی مقصود کیا ہے؟ وہ کیا غرض ہے جس کے لیے اس نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا اور شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں؟ تو اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ــــ نفوس انسانی کا تزکیہ ــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے جو دعا فرمائی ہے اس میں آپ کی بعثت کی اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کریں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (بقرہ - ۱۲۹)

اور اے ہمارے رب! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (بقرہ - ۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اسی طرح سورہ جمعہ میں آپ کی بعثت اور اس کے اغراض و مقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل پر ان الفاظ میں احسان جتایا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔

وہی خدا ہے جس نے اُمیوں (بنی اسمٰعیل) میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک اس سے پہلے وہ نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں جہاں تزکیہ کا ذکر آیا ہے وہاں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر آیا ہے تو ہم نے آپ کی یا انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد صرف تزکیہ کو کیسے قرار دے دیا؟ آخر دوسری چیزیں بھی تو اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں، وہ کیوں اصلی مقصد قرار پانے کی مستحق نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے اسلوب بیان نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی مقصدِ بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے وہ تزکیہ ہی ہے باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں ——— تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت ——— جو مذکور ہوئی ہیں تو وہ اصلی مقصد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اصلی مقصد کے وسائل و ذرائع کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورۂ بالا دونوں آیتوں میں سے ایک آیت (آیت ۱۲۹) میں تزکیہ کا لفظ سب کے آخر میں آیا ہے اور دوسری آیت (آیت ۱۵۱) میں سب کے شروع میں آیا ہے۔ ایک غور کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی بات کے بیان کرنے میں اسلوب کا یہ رد و بدل کم از کم قرآن مجید میں بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ اب غور کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس تقدیم و تاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبی کی تمام جد و جہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصود در اصل تزکیہ ہی ہے۔ کیونکہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی۔ وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطۂ اختتام بھی۔ وہیں سے وہ اپنا سفر شروع بھی کرتا ہے اور

وہیں اس کو ختم بھی کرتا ہے۔

کسی اسکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ موخر ہوتی ہے لیکن ارادہ اور خیال میں مقدم ہوتی ہے۔ آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور یہ چیز عین اس وقت آپ کے سامنے ہوتی ہے جبکہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ کے صفحہ پر بنا رہے ہوتے ہیں حالانکہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جبکہ مکان بن چکتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو مکان کی تعمیر سے جو اصل مقصد ہے (یعنی سکونت کی راحت) وہ شروع میں بھی آپ کے پیش نظر ہے اور آخر میں بھی پیش نظر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شروع میں آپ نے اس کو فکراً اور ارادۃً سامنے رکھا ہے اور آخر میں نتیجۃً۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک مکان کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ زمین پر جماتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس سے سکونت کی لذت و راحت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ تمام مراحل تعمیر سے گذر کر اس کے کرنے کی آخری اینٹ بھی رکھی جا چکی ہو کیونکہ درحقیقت یہی چیز ہے جو آپ کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں شروع سے آخر تک پیش نظر رہی ہے۔ خاہر ہے آپ نے پھاوڑے بھی چلائے، اینٹیں بھی پکوائیں، آرے بھی چلائے، چونا اور گارا بھی فراہم کیا، دیواریں بھی چنیں اور چھتیں بھی پاٹیں لیکن ان میں سے کوئی چیز فی نفسہٖ آپ کا مقصود نہیں رہی ہے۔ اس تمام کھکیڑ سے اصلی مقصد درحقیقت آپ کا یہ تھا کہ آپ کو سکونت کی آسائش حاصل ہو۔

اس مثال کو سامنے رکھکر اگر آپ انبیاء کی بعثت کے مقصد کو سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے اور اسی نقطۂ سے وہ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے دوسرے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے لیے وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ حکمت کا درس دیتے ہیں، مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی وہی ان کی تمام جدوجہد کی غایت بنتا ہے چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مذکورۂ بالا آیات میں سے ایک آیت میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی تمام سرگرمیوں کے نقطۂ آغاز کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور دوسری آیت میں اس کی غایت اور انتہا کی حیثیت سے

علاوہ ازیں قرآن مجید میں اس بات کی بھی صاف صاف تصریح موجود ہے کہ تزکیہ ہی وہ اصلی کام ہے جس کے لیے لوگوں کو نبی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور نبی کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کے لیے اس کی طرف رجوع کریں ان کو ہرگز مایوس نہ کرے۔ چنانچہ ایک موقع پر بعض اسباب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طالبِ تزکیہ کے معاملہ میں تھوڑی سی غفلت ہو گئی تو اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مندرجۂ ذیل الفاظ الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی:-

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۔ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۔ (عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر؟ شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔

اس آیت سے بالکل صاف واضح ہو رہا ہے کہ نبی خلقِ خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی اس ضرورت کو پورا کرے۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی اصلی مقصد اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۔ (۱۷-۱۸ - نازعات)

فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہو کیا ہے تیرے اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔

پھر یہ حقیقت بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ تزکیہ ہر شخص کی فلاح و نجاتِ آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ تزکیہ کی یہ اہمیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہی چیز انبیاء کی بعثت کی غایت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصد قرار پائے۔ چنانچہ قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح منحصر ہے تمام تر اس بات پر کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۔ (شمس)

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ) اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ حاصل کیا۔

ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات و فلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں، اور ان کو تزکیہ حاصل کرنے کے طریقے بتائیں۔

اوپر کے مباحث سے تین باتیں واضح ہوئیں ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیاءؑ کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔ دین میں جو اہمیت اس چیز کو حاصل ہے وہ اہمیت دوسری کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔ دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیز غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہے انبیاء علیہم السلام کی تمام سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو کیوں نہ رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا سرچشمہ اور اس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے۔ اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے اسرار و حقائق ہیں جو نبی کے ذریعہ سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ جمعہ کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں ان میں تزکیہ کو تلاوت آیات کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوت آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ (تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے) يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (ان کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے)

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور تمام گروہوں بلکہ پورے معاشرہ سے یکساں طور پر ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاح آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے جس کو پورا کیے بغیر کوئی شخص بھی جنت میں نہیں داخل ہو سکتا۔

تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نامکمل

اگر یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں (اور کوئی شخص بھی ان کے ثابت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا) تو ان سے دو نتیجے لازمی طور پر نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ کے علم کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ کو آپ کے مقاصد بعثت میں محض ایک ضمنی جگہ حاصل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہؤا اصل مقصد بعثت یہی ہے۔ پھر جو چیز اصل مقصدِ بعثت ہو اس کو پیغمبر نا تمام اور ناقص چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تزکیہ کی اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح شریعت کے تمام اصول کتاب و سنت کے اندر منضبط کر دیے گئے ہیں اسی طرح تزکیہ کے تمام اصول بھی کتاب و سنت کے اندر منضبط ہوں جس طرح شریعت کے اندر کسی بے راہ روی کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی کسی بے راہ روی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوق یا اپنے ذاتی رجحانات یا اپنے شخصی تجربات کو اس کے اندر گھسا دے اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود ایسی حد بندیاں ہونی چاہئیں کہ اشخاص و افراد کے اپنے میلانات و رجحانات کی در اندازیوں کے لیے کوئی منفذ باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ہر مجتہد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کتاب و سنت ہی کے اشارات کی کسوٹی پر پرکھتا اور پرکھواتا ہے اور اس کے بغیر اس کا کوئی اجتہاد بھی لائق قبول نہیں ٹھہرتا، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی اگر کوئی شخص کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہے تو اس کے لیے ناگزیر ہو کہ وہ کتاب و سنت کے اشارات اور نبیؐ اور صحابہؓ کے طرزِ عمل سے کوئی دلیل لائے، محض اپنے ذوق و وجدان کا حوالہ نہ دے، ورنہ اس کے اجتہاد کا کوئی وزن نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بسینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے۔ ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عوامی ضرورت کی ہو اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس

طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص ہر علم کا اہل نہیں ہوتا اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس علم کا ذوق رکھنے والا نہ ہوگا تو وہ اس سے محروم رہیگا۔ علیٰ ہذا القیاس اہل علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی "پر اسرار" علم ہے جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہو یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے۔ اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کے بجائے اس کو راز بنا کے رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرم راز بن جائیں۔ علم کیمیا کی تعلیم میں تو یہ رازداری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے اور اس کی عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے، تو اس میں اس رازداری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرین مصلحت۔ ہمارے حنفی علماء عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبر احاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے اس کے بارہ میں ایک ہی دو طریقوں سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوف کے کوچہ میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ان باتوں کو اہل ظاہر کیا جانیں، یہ اسرار و مواجید ہیں"۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیۂ نفس ہے تو تزکیۂ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہو سکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو؟

بعض احادیث سے غلط استدلال | جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ نتائج نہایت بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو ہم نے نکالے ہیں اور عقل عام بھی انہی کی تائید کرتی ہے لیکن ہمارے اہل تصوف حضرات اس علم کو ایک "پر اسرار علم" ثابت کرنے پر نہایت مصر ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے پر جہاں بہت سے مشائخ تصوف کے اقوال سے دلیل لاتے ہیں وہاں بعض احادیث اور بعض آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ مشائخ تصوف کے اقوال و ارشادات سے تو یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جن احادیث و آثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان کی حقیقت واضح کرنا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹک باقی ہی رہیگی۔

ان حضرات کا سب سے بڑا استدلال حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت سے ہے جو بخاری شریف میں حسب ذیل الفاظ میں وارد ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ فیکم فاما الاخر فلو بثثتہ لقطع ھذا البلعوم (بخاری)	ابوہریرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ظرف اکٹھے کیے تھے ایک ظرف کا علم تو میں نے تمہارے اندر پھیلا دیا۔ رہا دوسرا ظرف تو اگر اس کے علم کو میں تمہارے اندر پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ ایک ایسا ذخیرۂ علم بھی تھا جس کی حیثیت بالکل ایک سرِّ مخفی کی تھی جس کے حقائق اور باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہ تھا بلکہ صرف خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ علم ان حضرات کے خیال کے مطابق جمہور کے فہم اور ان کے مذاق و رجحان سے اس قدر مختلف بلکہ اس کے مخالف تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ ڈرتے تھے کہ اگر اس علم سے وہ پردہ اٹھا دیں تو لوگ ان کو جیتا نہ چھوڑیں۔

یہ نتائج نکال کر ان سے جو اثر یہ حضرات پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ان نتائج سے بھی زیادہ اہم اور دوررس ہے۔ ان کی آڑ لے کر یہ حضرات تصوف اور ائمہ تصوف کی ان ساری باتوں کو عین دین ثابت کرنا چاہتے ہیں جن کا کتاب و سنت سے کوئی جوڑ نہیں لگتا اور جن پر اہلِ حق ہمیشہ نکیر کرتے رہے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اہلِ تصوف کے اسرار و کشوف کے لیے دین میں بڑی گنجائش نکل آتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ علمِ دین صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا قرآن و حدیث میں نظر آتا ہے بلکہ علم دین کا بہت بڑا حصہ عوام کے اندیشوں سے خواص کے سینوں ہی میں محفوظ رہا اور اگر ان سے منتقل ہوا بھی تو صرف خواص ہی تک محدود رہا، عام اہل علم کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے پائی۔ عام اہلِ علم جنہوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کے واسطہ سے دین کو سیکھا ہے وہ تو صرف علم بالاحکام کے وارث ہوئے ہیں۔ اصلی علم تو علم باللہ ہے اور اس کی وراثت صرف ان لوگوں کو

[1] اس کی مثالیں مناسب مواقع پر اس سلسلۂ مباحث میں آئیں گی۔

منتقل ہوتی ہے جنہوں نے اس علم سینہ میں سے حصہ پایا ہے۔

یہاں سے یہ حضرات ایک قدم اور آگے بڑھا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اہلِ حقیقت اور اہلِ ظاہر کے معیارات بالکل الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک کی باتوں کو دوسرے کی کسوٹیوں پر جانچنا اصولی طور پر غلط ہے۔ اہلِ ظاہر جو کچھ کہتے ہیں وہ الفاظ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور اہلِ حقیقت کی نگاہیں معانی کی رازداں ہوتی ہیں ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ اثرات جو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاصے سنگین ہیں اور ان کی زد پوری شریعت پر پڑتی ہے اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کے تین پہلو ہو سکتے ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو جب یہ باتیں بتائی ہوں تو ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی فرما دی ہو کہ یہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ رکھنے کی ہیں، اگر تم نے ان کو ظاہر کیا تو یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں بطور راز کے تو نہ بتائی ہوں بلکہ تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے بتائی ہوں لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں ماحول اس قدر بدل چکا ہو کہ وہ باتیں لوگوں کے لیے بالکل اوپری بن کے رہ گئی ہوں اور ان کو پیش کرنا پیش کرنے والے کے لیے خطرہ سے خالی نہ رہ گیا ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی ہوں جن کے بیان و اظہار میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں اس وجہ سے حضرت ابوہریرہؓ کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ باتیں وہ بیان کرنی شروع کر دیں تو وقت کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں اُن کی جان کی خیر نہ رہے۔

اب عقل و نقل اور روایت و درایت سے ان تینوں پہلوؤں کو جانچیے اور پرکھیے کہ ان میں سے کون سا پہلو واضح نظر آتا ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی صورت تو بداہتہً غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ اس طرح کی پراسرار

باتوں کا کوئی ذخیرہ آنحضرت صلعم کو محفوظ ہی کرنا ہوتا تو اس امانت کے لیے موزوں ترسینہ فقہاء صحابہ میں سے کسی کا ہو سکتا تھا جو فہم و فقاہت اور راز داری دین ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ میں ممتاز تھے۔ اس کے لیے موزوں شخص حضرت ابوبکرؓ ہو سکتے تھے، حضرت عمرؓ ہو سکتے تھے، حضرت علیؓ ہو سکتے تھے، حضرت عثمانؓ ہو سکتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ ہو سکتے تھے، حضرت معاذ بن جبلؓ ہو سکتے تھے، حضرت ابوالدرداءؓ ہو سکتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ صحابہ میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے اور دین و شریعت کی باریکیوں کے سمجھنے اور مختلف چیزوں کے مدارج و مراتب کے امتیاز میں نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بجا طور پر اس علم کے حامل اور امین ہونے کے زیادہ اہل تھے جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ع

بر دار توان گفت بہ منبر نتوان گفت

حضرت ابوہریرہؓ کا ایک محدث اور ایک کثیر الروایۃ صحابی ہونے کی حیثیت سے جو درجہ ہے اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی باریکیاں سمجھنے میں ان کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو طبقۂ اول کے صحابہ کا ہے۔ اور اس حقیقت کو نبی صلعم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے!

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جو تعلیم و تلقین بھی فرمائی وہ چھپانے اور راز رکھنے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے ہی فرمائی۔ ہمیں قرآن یا حدیث میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے آنحضرت صلعم کی زندگی میں یا دوسرے انبیاء کی زندگی میں اس قسم کی صوفیانہ راز داری کا پتہ چلتا ہو۔ خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بار بار صحابہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ وہ جو کچھ آپ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں اس کو دوسروں کو بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرے منہ سے جو کچھ سنو اس کو محفوظ کر لو کیونکہ میرے مُنہ سے کوئی بات غلط نہیں نکلتی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سامعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو یہ ساری باتیں بتائیں جو موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگ دوسروں سے سن کر براہِ راست سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ حق بات جانتے ہوئے دوسروں کو اس کے بتانے سے گریز کرینگے قیامت کے دن ان کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائیگی اس طرح کی متعدد تاکیدات مختلف پہلوؤں سے ہمیں احادیث میں آپ کی طرف سے ملتی ہیں لیکن

کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپ نے کسی ایک صحابی سے بھی کوئی بات فرمائی ہو اور پھر یہ تاکید کی ہو کہ اس کو اپنے ہی تک راز رکھنا، دوسروں پر اس کو نہ کھولنا، ورنہ لوگ تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے۔ اس کے برخلاف بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ آپ نے کوئی بات بتائی ہے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اس کو بتانا اور کہنا اگرچہ اس کے سبب سے لوگ تمہارے دشمن ہی بن جائیں اور تمہیں نقصان ہی پہنچائیں۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے انبیاء اور ان کے صحابہ کی زندگیوں میں بھی ہمیں اس طرح کی ہدایات و تاکیدات کم و بیش انہی الفاظ میں ملتی ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لوگ ان باتوں کے سبب سے تمہیں بازاروں میں کوڑے لگائیں گے اور عدالتوں میں مجرم ٹھہرائیں گے مگر تم ان باتوں کی پروا نہ کرنا، تمہارا آسمانی باپ تمہارے ساتھ ہے۔

(۲) اب دوسری صورت کو لیجیے۔ یعنی اس بات کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں حضرت ابوہریرہؓ کو سکھائی اور بتائی تو ہوں تبلیغ و تعلیم کے عام مقصد ہی کے تحت لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کے حالات اس قدر متغیر ہو چکے ہوں کہ اب ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں زمانہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ ان کی وفات خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمانوں کے اندر طلب دین کا جوش سرد پڑ رہا تھا اور طلب دنیا کی سرگرمیاں اس کی جگہ پر غالب آنی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اس انقلاب حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی امیہ کے دور میں (کم از کم شروع میں) عوام کا مزاج اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ لوگ دین کی باتوں سے اس درجہ نامانوس اور بیگانہ ہو جائیں کہ ان کو پیغمبر کی حدیثیں سنانا بھی ایک پُرخطر کام بن جائے۔ اس دور میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک گروہ موجود تھا، ان کے شاگرد لوگ بھی ہر جگہ موجود تھے، ان کا اعزاز و احترام بھی اچھا خاصا لوگوں میں پایا جاتا تھا، احادیث کے نقل و روایت کی گرماگرمی بھی ہر جگہ موجود تھی۔ بہت سی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کے باوجود بھی فضا ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ دین کی باتوں کو بتانا اور سکھانا دشوار ہو جائے۔ اس دور میں عجمی تمدن اور عجمی علوم کا گھن بھی طبائع کو نہیں لگا تھا کہ لوگ اُس فطری سادگی اور دلکشی سے بالکل ہی نامانوس ہو جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال

میں پائی جاتی تھی۔ ذہنی اعتبار سے لوگ کچھ متغیر ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے پست نہیں ہو گئے تھے کہ ان میں اسلامی باتوں کے سمجھنے یا اسلامی اقدار کے احترام کی صلاحیت ہی سرے سے باقی نہ رہ گئی ہو۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں دین کی سادہ اور عام تعلیمات کے سمجھنے والے بھی موجود تھے اور دین کی گہری باتیں سمجھنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دین کی گہری باتوں کے سمجھنے کے اہل جس طرح ہر دور میں تھوڑے پائے گئے ہیں اسی طرح اس دور میں بھی ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ پس یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت ابوہریرۃؓ نے محض عوام کے فساد مذاق کے سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے علم کو ظاہر کرنے سے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کیا ہو۔

(۳) اب رہ گئی تیسری صورت یعنی حضرت ابوہریرۃؓ کا یہ ذخیرۂ علم ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے نقل و روایت اور جن کے پھیلنے میں وقت کے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

ہم کو یہی بات قرین قیاس اور عقل و نقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت ابوہریرۃؓ نے بنو امیہ کا دور اور مروان اور امرائے مروان کا جور دیکھا تھا۔ اِن کی وفات ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمان بنو امیہ کے استبداد کے شکنجہ میں اچھی طرح کسے جا چکے تھے اور بنو امیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہل حق کے دبا دینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ حضرت ابوہریرۃؓ کے ذخیرۂ علم میں ایسی بہت سی حدیثیں تھیں جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنو امیہ کے دور کے فتنوں، ان کے "ملک عضوض" (استبداد) اور ان کے "چھوکروں" کی ستم رانیوں اور ان کے ہاتھوں دین اور اہل دین کی بربادی کی بابت حضورؐ نے پیشین گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرۃؓ نے اسی قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ و نماز اور حج و زکوٰۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی و سیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کر دوں تو مستبدین وقت مجھے جیتا نہ چھوڑیں۔[1]

---

[1] حضرت ابوہریرۃؓ کے اس قول کا مطلب تو بلاشبہ یہی ہے لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح جان کے اندیشہ سے صحابہؓ نے رسولؐ کے دیے ہوئے علم کے ایک بڑے حصہ کو ضائع کر دیا اور وہ امت کی طرف منتقل (باقی ۳۶۱ پر)

حضرت ابو ہریرہؓ کے قول کا یہ مطلب عقل و نقل اور روایت و درایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے اور صرف میں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں چنانچہ لمعات میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے۔

وقیل اراد به اخبار الفتنِ وفسادَ الدینِ علی یدا غیلمة من قریشٍ وکان ابو هریرة یکنی عن بعضٍ ولا یُصرّحُ به خوفاً علی نفسه کقوله اعُوذ باللهِ من امارةِ الصِّبیانِ یشیرُ الی امارةِ یزید بنِ معاویةَ۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کا اشارہ ان احادیث کی طرف ہے جو فتنوں سے متعلق ہیں اور جن میں قریش و بنوامیہ کے چھوکروں کے ہاتھوں دین کی بربادی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ ان میں سے بعض کی طرف اپنے اقوال اور دعاؤں میں اشارہ بھی کرتے تھے لیکن اندیشۂ جان کے سبب سے نام لے کر ان کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے "میں چھوکروں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" اور اس سے ان کا اشارہ یزید بن معاویہ کی امارت کی طرف ہوتا تھا۔

دوسری حدیث جس سے یہ حضرات اپنے باطنی علم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں وہ عبداللہ بن مسعودؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔

عن ابن مسعودٍ قال قال لی رسولُ اللہ صلی اللہ علیه وسلم اُنزِلَ القرآنُ علی سبعةِ احرفٍ لکل اٰیةٍ منها ظهرٌ وبطنٌ۔ الحدیث

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن سات قراتوں پر نازل ہوا ہے اور ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن

(بقیہ حاشیہ ۳۲۲) ہونے ہی سے رہ گیا۔ حضرت ابو ہریرہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان روایات کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں محتاط ہو گئے ہیں، ان کو آزادی کے ساتھ کھلم کھلا نہیں بیان کرتے فتنہ کے اندیشہ سے صحابہؓ اس طرح کی باتوں کو صرف اپنے اہل اور لائق شاگردوں سے بیان کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے ان کا علم بعد والوں کو منتقل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی شہرت پہلے دور میں نہیں ہوئی بلکہ دوسرے یا تیسرے دور میں ہوئی۔ لیکن بہر حال علم رسول ضائع نہیں ہوا بلکہ اسلاف سے اخلاف تک منتقل ہو گیا اور یہی ہمارے سلف صالحین کی ذمہ داری تھی۔

اسی حدیث کے ہم معنی حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک قول بھی ہے جس میں انہوں نے قرآن کے ایک دریائے معانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے۔ قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہونگے۔ قرآن میں تمام علم اولین اور تمام علم آخرین ہے۔ قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا۔ قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہونگے یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے رازداں رہے ہیں لیکن اس مضمون کی احادیث و آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علم باطن بھی دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوس قدسیہ ہی رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے، ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اس کا کوئی باطن نہیں جس کی طرف رہنمائی خود اس کا ظاہر نہ کرے۔ قرآن کے اندر اسرار حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے، ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ بقدر استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔ اس معاملہ میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیل راہ نہیں بناتے۔ ایک فقیہ جس طرح قرآن حکیم سے ایک فقہی حکم مستنبط کرتا ہے اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل نہ پیش کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کے رہ جاتی ہے، اسی طرح ایک "صاحب اسرار" کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر بستر پہ، جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے، اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اس کے اس نکتہ کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے یہ نکتہ خانہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے[1]۔

[1] اس قسم کے اسرار کی دلچسپ مثالیں ہم آگے مناسب مواقع سے پیش کرینگے۔

پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حِکَم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو بھی انکار کی مجال نہیں ہے لیکن اسرار و حِکَم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانہ میں سے بقدر صلاحیت واستعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو لوگ کتاب الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کیے ہیں ان کا وہ حصہ بے شک صحیح ہے جو انہوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعہ سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں مگر مجرد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے، علم باطن کا ایک پورا انبار کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔

باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے۔ اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصود حقیقی ہے لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت وہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو وہ یہ جواب دے کہ "یہ باتیں باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، ان کو اہل ظاہر کیا جانیں"۔ قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے وہیں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں ظاہر کا باطن یہ ہے، کہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ایک ضروری گذارش

ناظرین ترجمان میں سے بعض حضرات مدیر ترجمان سے بعض مسائل و استفسارات دریافت کرتے ہیں اور خطوط میں اپنا مکمل پتہ لکھنے کے بجائے ترجمان میں جواب کی اشاعت کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن اس طرح کے تمام خطوط کا جواب رسالے میں دیا جانا ممکن ہے اور نہ ہی ضروری اور مناسب ہوتا ہے۔ عدم اشاعت کی صورت میں ان جوابات کا براہ راست بھیجا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اس لیے اس طرح کی خط و کتابت کرنے والے جملہ اصحاب سے درخواست ہے کہ وہ پورا پتہ تحریر فرمایا کریں تاکہ اگر جواب ترجمان میں دیا جانا ممکن نہ ہو تو ڈاک سے دیا جا سکے۔

رسائل و مسائل

ایمان اور عمل کا تعلق

سوال:۔ ائمہ سلف میں اس مسئلے کے بارے میں بہت اختلاف رہا ہے کہ عمل صالح ایمان کا جز ہے یا نہیں۔ میں نے قرآن و حدیث و سیرت کا بھی مطالعہ کیا ہے، اپنی حد تک ائمہ کے اقوال و استدلال کو بھی دیکھا ہے اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے بھی رجوع کیا ہے۔ لیکن اس سوال کا شافی جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض لوگوں نے محض اختلافات کو ہوا دینے کے لیے اس مسئلے کو چھیڑا ہے، لیکن میرا مقصد سوائے تحقیق و اطمینان کے کچھ نہیں ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ اس کا جواب بذریعہ ترجمان دیں۔

جواب:۔ اعمال کے جزو ایمان ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو خواہ مخواہ الجھا دیا گیا ہے، ورنہ بات بجائے خود صاف ہے۔ اس میں ایک جہت وہ ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اختیار کی ہے اور وہ بجائے خود حق ہے، مگر اعتراض کرنے والوں نے اُس جہت کو نظر انداز کر کے دوسری جہت سے اس پر اعتراض کر دیا۔ اسی طرح اس مسئلے کی ایک دوسری جہت وہ ہے جو امام بخاری وغیرہم نے اختیار کی اور وہ بھی برحق ہے، مگر رد کرنے والوں نے ایک مختلف جہت سے اس کو رد کرنا شروع کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اپنی اصل کے اعتبار سے شہادتِ قلب اور تصدیق ذہنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عمل اس لفظ کے مفہوم میں بداہتہً شامل نہیں ہے۔ آپ خود سوچیے کہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ "میں نے فلاں بات مان لی"، یا "میں اس کا "قائل ہو گیا"، یا "میں اس کی صداقت پہ گواہ ہوں"، تو سننے والا ان الفاظ سے کیا سمجھتا ہے؟ کیا محض عقیدہ و خیال کا اظہار؟ یا اس کے ساتھ کوئی عمل بھی؟ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ صرف عقیدہ و خیال کے اظہار کے لیے بولے جاتے ہیں، اور سننے والا یہ الفاظ سن کر بس اتنا ہی سمجھتا ہے

کہ آدمی کے خیالات میں تبدیلی آگئی ہے۔ ایمان کی یہی حقیقت قرآن و حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کی تفسیر خود یوں فرماتا ہے کہ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ اس تفسیر کی رو سے ایمان کی کوئی حقیقت مان لینے اور قائل ہو جانے کے سوا نہیں ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل کے سوال فاخبرنی عن الایمان کے جواب میں فرماتے ہیں اَنْ تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ۔ یہ تفسیر نبوی بھی ایمان کے معنی "مان لینے" ہی کے بتا رہی ہے نہ کہ اس کے ساتھ کچھ کرنے کے بھی۔ اسی بنا پر یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کلمۂ اسلام کا قائل ہو جانے کے بعد اچانک کسی حادثے کا شکار ہو جائے، قبل اس کے کہ وہ نماز پڑھے یا روزہ رکھے یا کوئی عمل اسلام پر کر سکے، تو وہ مومن مرےگا نہ کہ کافر۔

یہ اس مسئلے کی ایک جہت ہے، اور اس کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اب دوسری جہت لیجیے۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں فلاں بات کو مان گیا، تو آپ فطرۃً یہ توقع کرتے ہیں کہ اب اس کے عمل اور برتاؤ میں اس مان لینے کے آثار و نتائج ظاہر ہوں گے۔ ہر شخص کی عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک بات کو مان لینے کے جو لازمی آثار و نتائج ہیں وہ مان لینے والے کے عمل اور برتاؤ میں ظاہر ہوں۔ حتیٰ کہ اگر وہ ظاہر نہ ہوں، یا ایسے آثار ظاہر ہوں جو عقلاً نہ ماننے ہی کے آثار ہو سکتے ہوں، تو ہر دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ اس شخص نے درحقیقت وہ بات نہیں مانی ہے جس کے ماننے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں ماننے اور منوانے کا سارا کام جو کیا جاتا ہے اس سے مقصود محض مان لینا اور منوا لینا ہی نہیں ہوتا بلکہ منوانے والا اسی لیے کچھ باتیں منواتا ہے کہ اس کے بعد ماننے والا اس ماننے کے عملی تقاضے پورے کرے، اور ماننے والا جب ماننے کا اقرار و اعلان کرتا ہے تو ہر صاحب عقل اس کا مطلب یہی لیتا ہے کہ وہ اب اس ماننے کے تقاضے پورے کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی شخص کو شراب کی برائی کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ عملاً شراب نوشی سے اجتناب کرے، نہ اس لیے کہ وہ بس شراب کی برائی

کا قائل ہو جائے۔ اور جب وہ اس کا اقرار کرتا ہے کہ واقعی شراب بُری چیز ہے، تو ہر سننے والا اس کا مقصد یہی سمجھتا ہے، اور یہی اس سے توقع رکھتا ہے کہ وہ شراب سے اجتناب کرے گا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس اقرار کے بعد اُسے شراب پیتے دیکھ لے تو فوراً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ اپنے اقرار سے پھر گیا۔ یہی معاملہ اللہ کے دین کا بھی ہے۔ اللہ اور رسول نے لوگوں سے بعض حقیقتیں منوانے کی جو کوشش کی ہے اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بس انہیں مان لیں۔ بلکہ لازماً یہ بھی مقصود ہے کہ اُن کے اخلاق میں اُن کے اعمال میں، اُن کے برتاؤ میں، اور اُن کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہ آثار و نتائج ظاہر ہوں جو اس مان لینے کے لازمی آثار و نتائج ہیں۔ اللہ نے اپنے کلام پاک میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمودات میں صاف صاف اُن آثار و نتائج کو بیان بھی کر دیا ہے جو دعوتِ ایمان سے مطلوب و مقصود ہیں اور لازمۂ ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں پھر انہوں نے صرف ان آثارِ مطلوبہ کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ بعض آثار کے متعلق بالفاظِ صریح یہ فرما دیا ہے: "جن لوگوں کی زندگی میں وہ ظاہر نہ ہوں، یا ان کے برعکس آثار ظاہر ہوں وہ مومن نہیں ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں اس کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں جن سے کوئی صاحبِ علم آدمی ناواقف نہیں ہے اور اُن پر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو منفک نہیں ہو سکتا۔ چاہے اس کی یہ تعبیر لفظاً صحیح نہ ہو کہ "عمل جزوِ ایمان ہے"، مگر بہر حال عمل لازمۂ ایمان تو ضرور ہے۔

بلا شبہ محتاط فقہاء نے مجرد ترکِ عمل پر، جبکہ اس کے ساتھ کوئی صریح علامتِ کفر موجود نہ ہو، تکفیر سے احتراز کیا ہے۔ مگر اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ کسی مدعی اسلام کا بے عمل ہونا یعنی اس کا عملاً غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنا، جس طرح اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہو، اسی طرح اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ وہ غفلت میں مبتلا ہو یا اس کی سیرت میں ضعف ہو۔ ان دونوں احتمالات میں سے کسی ایک کو متعین کرنا ظاہر بین انسانوں کے لیے ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کا کوئی صریح ثبوت نہ مل جائے۔ لہٰذا مجرد بے عملی کی بنا پر تکفیر کر بیٹھنا خلافِ احتیاط ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ جو علیم بذات الصدور ہے، اس بات کو جانتا ہے کہ کس شخص کی بے عملی عدمِ ایمان کی بنا پر ہے، اور کس کی

بے عملی ضعف اخلاق یا غفلت کی بنا پر۔ جس شخص کی بے عملی درحقیقت ایمان کے فقدان پر مبنی ہو گی وہ بہر حال خدا کے ہاں تو کافر ہی اٹھے گا، خواہ دنیا کے مفتیوں نے اس کی تکفیر نہ کی ہو۔

یہ ہے اس معاملے کی اصل حقیقت۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا ہے وہ عجیب قسم کی افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض تو بے عمل مسلمانوں کو کھلم کھلا کافر کہہ دیتے ہیں، حالانکہ بے عملی کے دوسرے اسباب بھی ہونے کا قوی احتمال ہے۔ اور بعض حضرات تمام بے عمل مسلمانوں کو ایمان ہی کا نہیں بلکہ جنت کا مژدہ بھی دے رہے ہیں اور ذرا نہیں ڈرتے کہ اس طرح خدا کی نافرمانی پر لوگوں کی ہمت افزائی کرنا بجائے خود ایک سخت جرم ہے جس کی جواب دہی انہیں خدا کے ہاں کرنی ہو گی۔

حدیث کے بعض احکام کو خلافِ قرآن سمجھنے کی غلطی

سوال۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم نماز کی تیاری کریں تو ہمیں وضو کرنا چاہیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے از سرِ نو وضو کرنا ضروری ہے، نماز پڑھ لینے کے بعد وضو کی میعاد ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نماز کے لیے بہر حال الگ وضو کرنا لازمی ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ لوگ ایک وضو سے کئی کئی نمازیں کیوں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں وضو کے جو ارکان بیان ہوئے ہیں ان میں کلی کرنے اور ناک میں پانی لینے کا ذکر نہیں ہے اور نہ کہیں ایسے افعال و عوارض کی فہرست دی گئی ہے جن سے وضو ٹوٹتا ہے۔ اس صورت میں کلی وغیرہ کرنا اور بعض امور کو نواقضِ وضو قرار دینا کیا قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے؟

صلوٰۃ قصر کے بارے میں بھی قرآن وضاحت کرتا ہے کہ صرف پُرخطر سفرِ جہاد میں ہی نماز میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ کیا عام پرامن سفر میں قصر خلافِ قرآن نہیں ہے؟

جواب:۔ بلاشبہ وضو کے بارے میں قرآن مجید میں یہی حکم ہے کہ جب نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں صرف منہ دھونے

کا حکم ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منہ دھونے کا صحیح طریقہ اور یہ بھی بتلائیے کہ اس میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا بھی شامل ہے۔ قرآن میں صرف سر کے مسح کا حکم ہے مگر حضورؐ نے ہمیں بتایا کہ سر کے مسح میں کان کا مسح بھی شامل ہے۔ آپ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ وضو شروع کرتے وقت پہلے اُن ہاتھوں کو پاک کر لو جن سے تمہیں وضو کرنا ہے۔ یہ باتیں قرآن میں نہیں بتائی گئی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قرآنی کی تشریح کر کے ہمیں یہ باتیں بتائی ہیں۔ قرآن کے ساتھ نبیؐ کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ کتاب کے منشاء کو کھول کر ہمیں بتائے اور اُس پر عمل کر کے بتائے۔ آیت وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اے نبی! ہم نے یہ ذکر لوگوں کے پاس براہِ راست بھیج دینے کے بجائے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ اُس ہدایت کی تشریح کرو جو اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔

اس بات کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو آپ کو اپنے اِس سوال کا جواب سمجھنے میں بھی کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ ایک ہی وضو سے ایک سے زائد نمازیں پڑھنا کیوں جائز ہے۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ ایک وضو کی مدتِ قیام کس قدر ہے اور کن چیزوں سے یہ مدت ختم ہوتی ہے۔ اگر حضورؐ یہ نہ بتاتے تو ایک شخص یہ غلطی کر سکتا تھا کہ تازہ وضو کے بعد پیشاب کر لیتا یا کسی دوسرے ناقضِ وضو فعل کا صدور اُس سے ہو جاتا اور وہ پھر بھی نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ یا مثلاً دورانِ نماز میں ریح خارج ہو جانے کے باوجود نماز پڑھے جاتا۔ قرآن میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ نماز کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے، یہ نہیں بتایا گیا کہ وضو کب تک باقی رہتا ہے اور کن چیزوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص بطورِ خود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ابھی ابھی جس شخص نے وضو کیا ہے، ریح خارج ہونے سے اُس کے وضو میں کیا قباحت واقع ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ حضورؐ نے واضح طور پر یہ بتا دیا کہ وضو کو ساقط کرنے والے اسباب کیا ہیں تو اس سے خود بخود یہ بات نکل آئی کہ جب تک ان اسباب میں سے کوئی سبب رونما نہ ہو، وضو باقی رہے گا خواہ اس پر کتنے ہی گھنٹے گزر جائیں۔ اور جب ان میں سے کوئی سبب رونما ہو جائے تو وضو باقی نہ رہے گا۔ خواہ آدمی نے ابھی تازہ وضو کیا ہو اور اُس کے اعضاء بھی پوری طرح خشک نہ ہوئے ہوں۔

اگر ہم آپ کے اِس استدلال کو مان لیں کہ قرآن میں چونکہ حکم ہے کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو، اس لیے ہر نماز کے لیے تازہ وضو ضروری ہے، تو اسی طرح کا استدلال کر کے ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر مستطیع مسلمان کو ہر سال حج کے موقع پر حج کرنا چاہیے اور اس کے برعکس ایک دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ زکوٰۃ دے دینے سے حکمِ زکوٰۃ کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ تشریحِ رسول سے بے نیاز ہو کر ہر شخص قرآن کی ہر آیت کی ایک الگ تاویل و تعبیر کر سکتا ہے اور کسی ایک شخص کی رائے دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں بن سکتی۔ (وضو اور نواقضِ وضو کے بارے میں ایک سوال کا جواب میری مطبوعہ کتاب "رسائل و مسائل" میں تفہیمات کے عنوان کے تحت بھی دیا گیا ہے، آپ اُسے بھی ملاحظہ فرمالیں)

قصر کے متعلق سوال کرنے میں بھی آپ وہی غلطی کر رہے ہیں جو وضو کے معاملے میں آپ نے کی ہے۔ قرآن کے منشا کی تعیین میں قرآن لانے والے رسول کی توضیح و تشریح کو نظر انداز کرنا ایک بہت بڑی اصولی غلطی ہے جس کی بے شمار قباحتوں میں سے چند کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ قرآن صرف حالتِ خوف میں قصر کی صورت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس حالت میں صرف ایک رکعت بھی کفایت کر سکتی ہے۔ اس حکم میں کہیں بھی حالتِ امن کے قصر کی نفی موجود نہیں ہے۔ یہ دوسری قسم کا حکمِ قصر ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام سفر میں صبح اور مغرب کی نمازیں پوری پڑھی جائیں اور صرف چار رکعت والی نمازوں کو کم کر کے دو رکعت کر دیا جائے۔ اس قصر کو جو شخص خلافِ قرآن کہتا ہے وہ دو بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی چیز کے قرآن میں نہ ہونے اور اُس کے خلافِ قرآن ہونے کو ہم معنی سمجھتا ہے حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نبیؐ کے واسطے کو درمیان سے ہٹا کر براہِ راست قرآن کو لینا چاہتا ہے، حالانکہ خدا نے قرآن نبی کے واسطے سے بھیجا تھا۔ کیا وہ شخص یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا نے یہ واسطہ درمیان میں رکھ کر ایک فضول کام کیا ہے؟ ہم اس واسطے کے بغیر خود ہی قرآن سمجھ سکتے تھے۔

دُعا میں بزرگوں کی حُرمت وجاہ سے توسّل

سوال:- میں نے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ بجاہِ فلاں یا بحرمتِ فلاں کہہ کر خدا سے دعا کرنے

کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ اگرچہ اہلِ تصوف کے ہاں یہ ایک عام معمول ہے لیکن قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔ میں اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ سورۂ بقرہ میں اہلِ کتاب کے بارے میں آیا ہے وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یعنی بعثت محمدی سے پہلے یہودی کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کی تفسیر میں امام راغب نے مفردات میں فرمایا ہے ای لیستنصرون اللہ ببعثۃ محمدؐ (یعنی بعثت محمدی کے ذریعہ اللہ سے مدد مانگتے تھے) وقیل کانوا یقولون انا لننصر بمحمد علیہ السلام علی عبدۃ الاوثان (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودی یوں کہتے تھے کہ ہم کو بت پرستوں کے مقابلے میں محمد علیہ السلام کے ذریعہ سے نصرت بخشی جائے گی) وَقِیلَ یطلُبُونَ من اللّٰہِ بذکرہ الظفر (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے ذکر کے ذریعہ اللہ سے فتح مانگتے تھے)

ترمذی شریف کے ابواب الدعوات میں ایک حسن صحیح غریب حدیث مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری تکلیف کو دور کر دے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا کروں اور اگر صبر کر سکتے ہو تو صبر کرو۔ صبر تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا آپ دعا فرمائیں۔ آپ نے اُسے اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ۔ انی توجھت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی۔ اللھم فشفعہ فیّ۔ (خدایا! میں تیرے نبی محمدؐ نبی رحمت کے ذریعہ سے تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی اس حاجت کے لیے اسے پروردگار تیری طرف توجہ کی ہے تاکہ تو میری حاجت پوری کرے۔ پس اے اللہ میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما)۔ کیا اس آیت اور اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ دعا میں بحرمت سید المرسلینؐ یا بجاہ نبیؐ بطفیل نبیؐ یا ببرکت حضورؐ کہنا صحیح اور جائز ہے؟

جواب - آیت مذکورہ کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کے توسل سے کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب وہ ہے

جو امام راغبؒ کے پہلے دو اقوال سے بھی نکلتا ہے اور جس کی تائید معتبر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہودی اُن پیشینگوئیوں کی بنا پر جو آپؐ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی آئے اور پھر اُس کی بدولت ہمیں کفار پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ابن ہشام کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر جب پہلی مرتبہ مدینہ کے چند لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی اور آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ آپس میں کہنے لگے یَا قَوْمِ تَعْلَمُوْا وَاللہِ اَنَّہُ لَلنَّبِیُّ الَّذِیْ تَوَعَّدُکُمْ بِہِ الْیَھُوْدُ فَلَا تَسْبِقُنَّکُمْ اِلَیْہِ (ج ۲ ص۷۰) "لوگو! جان لو کہ بخدا یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کا خوف تم کو یہودی دلایا کرتے تھے۔ پس ایسا نہ ہونے پائے کہ تم سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ جائیں"۔ پھر آگے چل کر ابن ہشام اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انصارِ مدینہ کے بڑے بوڑھوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ فِیْنَا واللہ وفیھم نزلت ھذہ القصة۔ کنا قد علوناھم ظھرًا فی الجاھلیة ونحن اھل الشرك وھم اھل کتاب۔ فکانوا یقولون لنا اِنَّ نبیًّا یبعث الآن نتبعه قد اظل زمانه۔ نقتلکم معه قتل عاد وارم۔ فلما بعث اللہ رسوله صلی اللہ علیه وسلم من قریش فاتَّبعناہ وکفروا به" یعنی یہ آیت ہمارے اور یہودیوں کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جاہلیت میں ہم ان پر غالب ہو گئے تھے اور ہم اہلِ شرک تھے۔ پس وہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی آمد کا وقت آپہنچا ہے ہم اس کی قیادت میں تم کو اس طرح ماریں گے جیسے عاد و ارم مارے گئے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش سے مبعوث کیا تو ہم نے آپ کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں نے آپ کا انکار کر دیا"۔

رہی جامع ترمذی کی وہ حدیث جو آپ نے نقل فرمائی ہے تو اس کا مضمون تو آپ ہی بتا رہا ہے کہ استدعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی تھی کہ آپ دعا فرمائیں اور آپ نے ہدایت فرمائی کہ اچھا تو اللہ سے دعا کر کہ "خدایا میں تیرے نبی کے واسطے سے تیرے حضور اپنی حاجت لے کر آیا ہوں۔ تو میرے حق میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول کر"۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کے حق میں دعا فرمائی اور اس سے بھی فرمایا کہ میرے واسطے سے تو بھی اپنی حاجت طلب کر اور میری سفارش قبول کیے جانے کی بھی دعا مانگ۔ یہ تو دعا کی بالکل ایک فطری صورت ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

مطبوعات

SOME PROBLEMS OF MOHAMMADAN AND ANGLO MOHAMMADAN LAW.

از جناب قاضی نصیر الدین احمد صاحب۔ بی اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ۔ یوسف چیمبرز۔ بندر روڈ کراچی۔ قیمت درج نہیں۔

نکاح، طلاق، ادراثت وغیرہ معاملات میں محمڈن لا کے نام سے انگریزی دور میں مسلمانوں کے لیے جو پرسنل لا ارتقاء پذیر ہوا ہے وہ اصل اسلامی قانون کے تقاضوں سے بہت دور نکل گیا ہے۔ پھر یہ پرسنل لا جن اسلامی قواعد و ضوابط پر مبنی ہے ان کے مقاصد بھی اس لیے پورے نہیں ہو سکتے کہ ملکی قوانین کا پورا مزاج ان سے مناسبت نہیں رکھتا۔ مثلاً اسلام کا ضابطۂ نکاح و طلاق، اور اسی طرح اولاد کے جائز و ناجائز ہونے کا قانون ایک ایسے مکمل قانونی نظام کے فطری اجزاء ہیں جو زنا کی ہر شکل کو حرام قرار دیتا ہے اور اس کا پوری طرح سدباب کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ان قوانین و ضوابط کو اگر ایک ایسے قانونی نظام میں جڑ دیا جائے جو زنا اور نکاح کو متوازی طور پر سے چلنا چاہتا ہو تو پھر یہ قوانین و ضوابط بڑی پیچیدگیوں سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی ضابطۂ نکاح و طلاق یا دوسرے تمدنی معاملات کے قوانین خود اسلام ہی کے قانونِ شہادت کے ساتھ جس صحت کے ساتھ کام کر سکتے ہیں، انگریزی ضابطۂ شہادت (EVIDANCE ACT) کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انگریزی دور میں ایک طرف ہمارے ضوابط مسخ ہوتے رہے ہیں اور دوسری طرف ان سے طرح طرح کی پیچیدگیاں رونما ہوتی رہی ہیں، جن کی وجہ سے عدالتی فیصلوں میں تضاد آگیا ہے۔

جناب مؤلف نے اس طرح کی پیچیدگیوں اور عدالتی فیصلوں کے تضاد کو پیش کر کے ترغیب دلائی ہے کہ اینگلو محمڈن لا میں ضروری ترمیمات کی جانی چاہئیں۔ خاص طور پر پیش نظر انگریزی کتابچے میں موصوف نے حسب ذیل قانونی مسائل کو چھیڑا ہے:-

(۱) اولاد کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں مسلم لا اور انگریزی ضابطۂ شہادت (EVIDANCE ACT)

کی دفعہ ۱۱۲ باہم متصادم ہیں اور اس تصادم کی وجہ سے عدالتی فیصلے بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ مثلاً (الف) مذکورہ دفعہ ۱۱۲ ایک حاملہ عورت سے نکاح کو جائز ٹھیراتی ہے، حالانکہ اسلامی قانون اس کے خلاف ہے (ب) مذکورہ دفعہ ۱۱۲ کے رُو سے نکاح کے چند دن یا چند ساعتیں بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز اولاد شمار ہوگا، لیکن کوئی مسلمان اسے ماننے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ (ج) فرض کیجیے کہ ایک شخص سہواً (مغالطے اور دھوکے میں آکر) کسی ایسی عورت سے مقاربت کر بیٹھتا ہے جو اس کی منکوحہ نہ تھی۔ اس تعلق سے جو اولاد ہوگی، شیعی فقہ کی رُو سے اس کی سرپرستی و کفالت اُسی شخص پر عائد ہوگی، لیکن مذکورہ دفعہ ۱۱۲ نہ تو اسے جائز اولاد تسلیم کرتی ہے، نہ اسے اُس شخص سے منسوب ہی کرنے کو روا رکھتی ہے ـــــ کیونکہ دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج موجود نہیں ہے (د) مذکورہ دفعہ ۱۱۲ کے لحاظ سے ہر وہ اولاد جائز شمار ہوگی جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج موجود ہونے کے دوران میں کسی وقت بھی پیدا ہو، یا ان کے رشتۂ ازدواج کے انقطاع کے بعد ۲۸۰ روز کے اندر اندر پیدا ہو، لیکن اسلامی قانون کے لحاظ سے لعان کی صورت میں رشتۂ ازدواج قائم ہونے کے باوجود اولاد ناجائز شمار ہو سکتی ہے، چاہے وہ نکاح کے ۲۸۰ روز بعد ہی کیوں نہ پیدا ہوئی ہو۔ (ر) دفعہ ۱۱۲ نکاح کو صرف جائز اور ناجائز میں تقسیم کرتی ہے، لیکن حنفی قانون نکاح کی تین قسمیں قرار دیتا ہے، ایک جائز، دوسرے فاسد، تیسرے باطل۔ چنانچہ حنفی قانون کی رُو سے فاسد نکاح کے تحت ہونے والی اولاد جائز اولاد شمار ہوتی ہے، اگرچہ نکاح جائز نہیں ہوتا۔ حنفی فقہ سے یہاں دفعہ ۱۱۲ ٹکرا جاتی ہے۔

اب مؤلف کی تجویز یہ ہے کہ ایک ترمیم کے ذریعے اس مسئلے میں دفعہ ۱۱۲ کی اس مداخلت کو ختم کر دیا جائے تاکہ معاملات کا فیصلہ ٹھیک اسلامی قانون کے مطابق ہونے لگے۔

(۲) طلاق ثلاثہ (بیک مجلس)، کے بارے میں مؤلف نے یہ چاہا ہے کہ علماء اور قانون ساز حضرات ایک سانس میں تین طلاق دے دینے کو قانوناً ایک طلاق قرار دیے جانے کے مسئلے پر غور کریں، تاکہ قرآن کے سکھائے ہوئے اسلوب طلاق کا احیاء کیا جا سکے۔

(۳) ایک بڑا جھگڑا موجودہ قانون کے سامنے زوجہ کے نفقہ کا ہے۔ اور اس میں حسب ذیل اشکالات قابل حل ہیں (ا) کیا ناشزہ کو بھی بروئے قانون نفقہ وصول کرنے کا حق ہے؟ (ب) کیا نفقہ دینے کی عدم

استطاعت کی صورت میں بھی عورت کو قانون اسی طرح خلع کا حق دیتا ہے جیسے کہ بالارادہ نفقہ روکنے کی صورت میں؟ ان دونوں سوالات کے بارے میں موجودہ قانون اور اسلامی قانون میں منافات ہے۔

(۲) آیا قاضی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار بروئے قانونِ اسلامی ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں خود اسلامی قانون کے مدارسِ فکر میں اختلاف موجود ہے۔ مثلاً شافعی اور مالکی فقہ قاضی کو اس کا مجاز قرار دیتی ہے لیکن حنفی فقہ کا قاعدہ یہ ہے کہ نکاح کا رشتہ توڑنے کا اختیار صرف شوہر کو ہے (بیدہٖ عقدۃ النکاح) اس لیے قاضی انصاف قائم کرنے کے لیے اُسے صرف طلاق کا حکم دے سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ حکم نہ مانے تو پھر چونکہ وہ خدا کے قانون سے سرتابی کرنے کا مجرم ہوگا اس لیے قاضی پھر اللہ کے حکم کو بالجبر نافذ کرنے کا مختار ہے۔ موجودہ قانون فقہ حنفی کے خلاف فسخ نکاح کا پورا پورا اختیار عدالت کو دیتا ہے۔ مؤلف نے اس پہلو سے ترمیم کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔

مؤلف نے ان مسائل میں جس طرح دلچسپی لی ہے وہ ہمارے نزدیک قابلِ قدر ہے، اور ہمارے علمائے دین اور قانون کی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کو موجودہ اینگلو محمڈن لا پر ہی نہیں، پورے قانونی نظام پر اسی طرح کی بحث و نظر کا آغاز کرنا چاہیے۔ تاہم ہم کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پیشِ نظر کتابچے کو پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مؤلف کے نزدیک پاکستان میں بھی عام قانونِ ملکی تو جو بھی رہے رہے، بس اس میں مسلمانوں کا پرسنل لا اپنی زیادہ مکمل اور خالص شکل میں چلنا چاہیے۔ حالانکہ اسلام نے کوئی قانون ایسا نہیں پیش کیا ہے جو کسی غیر اسلامی قانونی نظام کے زیرِ سایہ پروان چڑھ سکے اور اپنے مقاصد پورے کر سکے۔ اسلام تو ایک پورا قانونی نظام اپنا رکھتا ہے اور وہ اس کے ٹکڑے کرنے اور ان میں سے کچھ کو پسند کر لینے اور کچھ کو چھوڑ دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ پاکستان اس لیے حاصل نہیں کیا گیا ہے کہ یہاں بس مسلمانوں کو نکاح و طلاق کے معاملات اسلامی قانون کے مطابق طے کرلینے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ پس اب انگریزی ضابطۂ شہادت میں جزوی ترمیمات کی منصوبہ بندی کرنے سے آگے بڑھ کر اسے بالکل برطرف کرنے کی فکر کیجیے اور اس کے بجائے اسلامی ضابطۂ شہادت کی تدوین و تنفیذ کی تیاریاں کیجیے۔ اسی طرح فوجداری اور دیوانی قوانین کو از سرتاپا اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے

لیے بحث و تحقیق کا آغاز ہونا چاہیے۔ جزوی ترمیموں کی ضرورت ایک مختصر سے عبوری وقفے کے لیے تو ہے، مگر یہ اصل کام نہیں ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ قاضی صاحب پاکستانی معاشرہ کے بقا و ارتقاء کے لیے قانونِ شریعت کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں:

کرنے کا کام | از جناب مولانا عبدالغفار صاحب لکھوکے، ضلع فیروزپور، مشرقی پنجاب۔ ملنے کا پتہ: ناظم جامعہ محمدیہ، اوکاڑہ، ضلع منٹگمری (پاکستان)، قیمت فی جلد چار روپے۔

یہ کتاب صرف سرسری نظر سے دیکھی جا سکی ہے۔ مختلف مقامات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوا کہ اچھی نیت اور اچھے مقصد اور دردِ دل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ مصنف کا مطلوب اسلام ہی کا احیاء ہے، وہ عوام کو منظم زندگی کی تربیت دینا چاہتے ہیں اور تنظیم کا محور نماز کو بنانا چاہتے ہیں لیکن پروگرام جس غیر معمولی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور پھر اس کے لیے جو اندازِ تحریر اختیار کیا گیا ہے وہ مشکل ہی سے چند سطریں تسلسل سے پڑھتے چلے جانے کی ہمت قاری میں برقرار رہنے دیتا ہے۔

درست اردو | از جناب پروفیسر عاصی ضیائی صاحب، رام پوری مرے کالج، سیالکوٹ۔ شائع کردہ: مکتبہ فروغ اردو، بازار ٹھٹھیاراں، سیالکوٹ شہر۔ قیمت عمر

عاصی ضیائی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اردو زبان کے میدان میں قلم اٹھائیں اور درست اردو کی طرف رہنمائی کریں کیونکہ وہ اردو زبان کی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں اور زبان کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اور اس میدان میں فکر و کاوش سے قابلِ اعتماد حد تک کام لیا ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں گرامر، محاورہ و روزمرہ، فصاحت و بلاغت، تلفظ، تذکیر و تانیث اور اوقاف کے لحاظ سے ان غلطیوں سے بچنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن میں ہمارے اچھے اچھے اہلِ ذوق، بلکہ خود ادیب، صحافی اور مقرر تک بالعموم مبتلا پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر عاصی صاحب نے اُن غلطیوں پر کڑا احتساب کیا ہے جو "پنجابیت" کے زیرِ اثر پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ساتھ کے ساتھ یوپی والوں کی شدت کے خلاف بھی احتجاج کیا ہے۔

نئی کتاب حصہ پنجم | مولفہ سلیم عبداللہ صاحب۔ شائع کردہ: اعلیٰ اکیڈمی سندھ۔ کراچی۔ قیمت عہر

یہ فیڈرل ایریا کراچی کے محکمۂ تعلیم کی منظور کردہ نصابی کتاب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس میں معلوماتِ عامہ کا پہلو بھی روشن ہے اور بچوں کو اسلامی خیالات اور جذبات سے آراستہ کرنے کے لحاظ سے بھی یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس کتاب میں خدا کے خالق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حاکم ہونے کا تصور بھی دلایا گیا ہے، اسلام کا نظریۂ خلافت پیش کیا گیا ہے، ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی ذمہ داریوں کا شعور دلایا گیا ہے، بنو امیہ کے استبداد کے خلاف امام حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم کے مجاہدانہ کارناموں کو بڑی خوبی سے سامنے لایا گیا ہے۔ گندے سینما سے نفرت دلائی گئی ہے اور لباس میں اندھی تقلید کے بجائے صحیح مقاصد کو معیار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ قائد اعظم کے لیے "روحانی باپ" اور "پاکستان کا باپ" کے کلمات احترام اسلامی ذوق سے سازگار نہیں ہیں۔ مولف کی اپنی نظمیں جو شامل کتاب ہیں وہ بسا اوقات حدود بحر سے خارج ہو گئی ہیں۔

حلال و حرام کی تحقیق | مرتبہ سید محمد صبیح صاحب ایڈوکیٹ، دارالاشاعت قرآن، ٹھٹھہ (سندھ) قیمت ۸ آنے۔

یہ کتابچہ خالص "قرآنی اسلام" کے ایک داعی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں تحقیق یہ پیش کی گئی ہے کہ (ا) قرآن میں صرف مردار، خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے، لہٰذا درندے، کُتّے، گدھے، مینڈک چوہے وغیرہ سب حلال ہیں۔ (ب) جس چیز کو اللہ نے حرام قرار نہیں دیا ہے اس کے کھانے سے انکار کرنا قرآن سے انحراف ہے، جو کچھ حلال ہے اس کے لیے حکم ہے کہ اسے کھاؤ۔ (ج) مچھلی بغیر ذبح کیے کھانا مردار کھانے کی تعریف میں داخل ہے۔ کتاب کے مباحث، طرزِ استدلال اور انداز بیان سب منکرینِ حدیث حضرات کے پیٹنٹ ہیں۔ اور اس کا خاص ہدف مولانا مودودی ہیں۔

کالے قوانین | مرتبہ:۔ اسعد گیلانی۔ شائع کردہ: مکتبۂ جہانِ نو کراچی۔ قیمت ۸/-

یہ ایک منثور قصیدہ ہے جو اسعد گیلانی نے جبر و تشدد کی اُس تلوار کی شان میں لکھا ہے جس سے نہ صرف پاکستان کے ادب و صحافت اور جمہوریت کے شہری حقوق کا قتل عام ہوا ہے، بلکہ جس کے زخم خود اسعد نے بھی کھائے ہیں۔ یہ سیفٹی قوانین اور ان کے استعمال کا ایک محققانہ جائزہ بھی ہے اور اس سلسلے میں رائے عام کے ترجمانوں کے ردِ عمل کا آئینہ بھی؛ ہر شہری کے مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔

(بقیہ اشارات)

کے مدمقابل بن کر اپنی مخالفانہ جتھہ بندی کیے ہوئے تھے۔ ایسا ہی معاملہ ٹھیکوں اور تجارتوں اور زمینوں کے بارے میں بھی کیا گیا۔

(۵) اب یہ گروہ اپنے اس گہرے احساس کی بنا پر کہ پاکستان کا مسلم معاشرہ آزاد ہونے کے بعد زیادہ دیر تک اسے برداشت نہ کریگا بہت تیزی کے ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ایک طرف اس کے تمام وہ افراد جو ذمہ دار سرکاری عہدوں پر ہیں حکومت کے ہر شعبے میں اپنے آدمی بھر رہے ہیں، اور معاشی وسائل و ذرائع پر بھی قادیانیوں کا زیادہ سے زیادہ قبضہ کرا رہے ہیں تاکہ تھوڑی مدت ہی میں ان کی طاقت اتنی مضبوط ہو جائے کہ پاکستان کے مسلمان آزاد و خود مختار ہونے کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ دوسری طرف وہ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ کم از کم بلوچستان پر قبضہ کر کے پاکستان کے اندر اپنی ایک ریاست بنا لیں۔

ان وجوہ سے پاکستان کی تمام دینی جماعتوں نے بالاتفاق مطالبہ کیا ہے کہ اس سرطان کے پھوڑے کو مسلم معاشرے کے جسم سے، فوراً کاٹ پھینکا جائے، اور سر ظفر اللہ خاں کو وزارت کے منصب سے ہٹا دیا جائے جن کی بدولت ملک کے اندر بھی اور باہر کے مسلم ممالک میں بھی اس سرطان کی جڑیں پھیل رہی ہیں، اور قادیانیوں کو پاکستان کے کلیدی مناصب سے ہٹانے اور ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے ان کا حصہ مقرر کرنے کی جلدی سے جلدی فکر کی جائے۔

مگر حکومتِ پاکستان کو اِس سے انکار ہے، پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو اس سے انکار ہے، حکومت کے ذمہ دار عہدہ داروں کو اس سے انکار ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کا ایک بڑا حصہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ یہ محض مسلمانوں کی باہمی فرقہ وارانہ لڑائیوں کا ایک شاخسانہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس کو بھی اس تجویز سے اختلاف ہے اس کے پاس آخر دلیل کیا ہے؟ ہم نے اپنے دلائل پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیے ہیں۔ اب اگر کسی کے پاس جواب میں کوئی دلیل ہے تو وہ سامنے لائے، ورنہ بلا دلیل ایک بات پر اڑ جانا، جس کا الزام کبھی "ملا" کو دیا جاتا تھا اب اس کے ترکیب وہ

لوگ ہونگے جو "ملاّ" نہ ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور وہ یقین رکھیں کہ رائے عام اور دلیل کی متفقہ طاقت ان کو آخرکار نیچا دکھا کر رہے گی

اس میں شک نہیں کہ اس مطالبے کو منوانے کے لیے عوام جس طریقے سے مظاہرے کر رہے ہیں وہ شائستہ نہیں ہے، اور ملک کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ کسی طرح اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی قوم کے عوام کو یہ تربیت دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ابھی چند ہی سال پہلے اسی پنجاب میں ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے مسلم لیگ نے جو ایجی ٹیشن کیا تھا، اس تازہ ایجی ٹیشن سے اپنی کونسی خصوصیات میں کچھ گھٹ کر تھا؟ یہ تو موجودہ قائدینِ ملت کا اپنا لگایا ہوا باغ ہے جس کی بہار دیکھ کر وہ آج گھبرا اٹھے ہیں۔ اب اس مظاہرۂ ناشائستگی کا الزام "ملا" کو دیا جا رہا ہے۔ مگر ہمیں بتایا جائے کہ خضر حیات خاں کے خلاف جس شائستگی کے مظاہرے ہوئے تھے وہ کس ملا نے کرائے تھے؟ اینٹی ملا حضرات کا تو اب یہ منہ نہیں ہے کہ شائستگی و ناشائستگی کا سوال چھیڑیں۔ انہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ مطالبہ معقول ہے یا نہیں، اور اس کی پشت پر رائے عام کی طاقت ہے یا نہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں ثابت ہیں تو پھر جمہوری نظام میں کسی منطق سے ان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

بقیہ رسائل و مسائل

کوئی شخص مجھ سے کہے کہ فلاں حاکم کے پاس چل کر میری سفارش کر دو اور میں سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ اس شخص سے بھی کہوں کہ تو خود بھی حاکم سے عرض کر کہ میں انہیں سفارشی بنا کر لایا ہوں، آپ ان کی سفارش قبول کر کے میری حاجت پوری کر دیں۔ یہ معاملہ اور ہے۔ اس کے برعکس یہ ایک بالکل دوسرا طریق معاملہ ہے کہ کوئی شخص مجھ سے اجازت لیے بغیر خود ہی حاکم کے پاس پہنچ جائے اور اپنی جو حاجت بھی چاہے میرا واسطہ دے کر پیش کر دے۔ اس دوسری صورت کو آخر پہلی صورت پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ دلیل پہلی صورت کی پیش کرنا اور اس سے جواز دوسری صورت کا نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ دوسری صورت کا جواز ثابت کرنے کے لیے تو حضورؐ کا کوئی ایسا قول ملنا چاہیے جس میں آپ نے اپنے تمام نام لیواؤں کو عام اجازت مرحمت فرمائی ہو کہ جس کا جی چاہے، اپنی ہر حاجت میرا واسطہ دے کر اللہ سے طلب کر لے۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE
(Pakistan)

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے، اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ، طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان — جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مدد گار ثابت ہو گی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

ملنے کا پتہ،

جلد شائع ہورہی ہے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور۔ پاکستان

سرورق ربن پریس لاہور میں چھپا